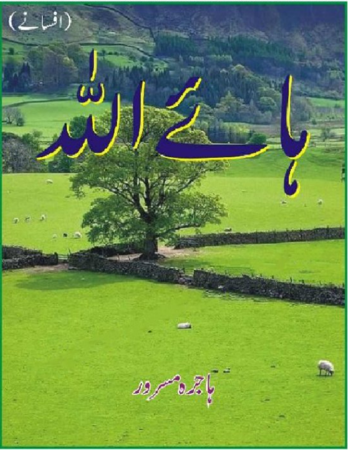
(افسانے)
ہائے اللہ
ہاجرہ مسرور

ہائے اللہ

(افسانے)

ہاجرہ مسرور

کتے

''لے لے دھت......'' دعوت بھی اور دھتکار بھی۔ بڑی عجیب حرکت ہے نا؟ اور یہ حرکت کرتا ہے للو حلوائی۔ اسے جہاں کوئی کتا دکان کی طرف منہ اٹھائے دیتا ہے۔ بس وہ بیٹھے ہی بیٹھے پیچھے کی طرف سرک سرک کر پوری طاقت سے دھتکارے ہوئے باسی بتاسی مٹھائیاں جو خاص اسی مقصد کے لیے الگ تھالی میں پڑی رہتی ہیں' ذرا ذرا اٹھا کر کتے کے سامنے پھینکنے لگتا ہے اور اس حرکت سے اس کی حالت کچھ عجیب سی ہو جاتی۔ ایسی کہ دیکھنے والے بغیر ہنسے نہ رہ سکتے۔ لیکن ہنسنے والوں کا کیا؟ سمجھیں نہ بوجھیں۔ کھیسیں نکال دینے سے مطلب۔ کچھ زیادہ دماغ لڑایا تو یہ کہ بیچارے للو کا دماغ چل گیا ہے۔ جبھی تو میاں کتوں کو مٹھائیاں کھلاتا ہے۔ ہونہہ! کوئی اس کے دل سے پوچھے سڑک پر پڑے ہوئے کتوں کی اہمیت۔ دیکھنے میں تو وہ ہیں' بھوکے' مرجھلے' جو ذرا دھمکائے سے کیں کیں کر کے ادھر ادھر دبک کر اپنی ابھری ہوئی پسلیوں کی دھونکنیاں ذرا تیز کر دیتے ہیں۔ مگر ان کتوں کا مرجھلا پن اور یوں دبکنا ہی تو للو کو کسی خوفناک اقدام کا پیش خیمہ معلوم ہوتا ہے۔

بات کچھ یوں تھی۔

شہر کے سب سے زیادہ عجیب لیکن اہم دو منزلہ بازار میں للو کی دکان اپنے سر پر اور آس پاس کئی بہت اونچی دکانیں رکھنے کی وجہ سے بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ دن بھر تو خیر وہ اچھی طرح دکان لگاتا ہی نہیں تھا۔ لیکن جیسے ہی دھوپ ڈھلتی اور بالائی منزلوں پر بجی ہوئی دکانوں میں قسم قسم کی عورتوں کو چھجوں کے شوکیس میں دیکھتا تو اس کے بھاری بھرکم جسم میں ایسی چستی آ جاتی کہ جھپٹ جھپٹ کر کوٹھڑی سے مٹھائیوں کے تھال نکال نکال کر پیتل کے پترے منڈھے ہوئے لکڑی کے تختے پر سجانے لگتا۔ چاندی کے ورقوں سے ڈھکی ہوئی رنگ برنگی مٹھائیاں جن کو دیکھ کر منہ میں پانی بھر آئے لیکن کھا کر؟ دکان کے سامنے ہی لکڑی کی پرانی سیاہ تختی پر لکھا ہے۔ ''خالص گھی کی عمدہ مٹھائیاں۔'' شاید یہ اس وقت کی بات ہوگی جب اس تختی کے حروف دور سے چمکتے ہوں گے۔ اب تو اس کے حروف جیسے جیسے دھندلے پڑتے جاتے تھے ویسے ویسے خالص گھی کی عمدہ مٹھائیاں بھی خواب ہوتی جا رہی تھیں۔ آس پاس والے دیکھتے کہ اس تختی کی چوٹ پر اسی جگہ ٹھاٹ سے بناسپتی گھی کے کنستر پر کنستر کھول کر بڑے کڑھاؤ میں اوندھا دیے جاتے۔ سڑے بسے لڑیاں لگے میدے

کھٹے کھوئے اور سستے مال مسالے کی بنی ہوئی مٹھائیاں مزے سے تل دی جاتیں لیکن دیکھنے والے چوں نہ کرتے۔ اور کرتے بھی تو کس منہ سے؟ یہاں تو کبھی للو کی مٹھائیوں جیسا مال اپنا بھی پاتے۔ ہاں تو بازار سجتے ہی للو کی دکان بھی سج جاتی۔ بے فکرے گاہکوں کی ٹولیوں کی ٹولیاں سمٹی سکڑی اور بل کھاتی ہوئی سڑک پر پھیل کر اس طرح مٹر گشت کرنے لگتیں جیسے رات بھر ٹاپے تلے بند رہنے والی مرغیاں صبح کو چگنے کے لیے چھوڑ دی جائیں۔ اس وقت سے بس للو کی دکان کے آگے خاصا جمگھٹ سا لگ جاتا۔ بکری تو خیر دن میں بہت نہ ہوتی۔ گاہک آئے یوں ہی آنے دو آنے کی چیز خریدی اور دکان کے تختے سے بھڑ کر دس پانچ منٹ کو کھڑے ہو گئے۔ کیونکہ سامنے والی دکان سچ مچ بڑی اونچی تھی۔ اتنی اونچی کہ ایسے ویسے لوگوں کی ہمت نہ پڑتی اوپر جانے کی لیکن نیچے والے پھر بھی اوپر ہی دیکھتے۔ سنتے ہیں قطب کی لاٹ بڑی اونچی ہے' اچھے ہٹے کٹے لوگ تو خیر اس بلندی کا اندازہ سینکڑوں سیڑھیاں طے کر کے لگا لیتے ہیں۔ جن کی ٹانگوں میں اتنا دم نہیں ہوتا وہ نیچے ہی سے کھڑے کھڑے اس کی بلندی دیکھنے کے لیے منہ اٹھا دیتے ہیں اور اٹھاتے ہی چلے جاتے ہیں۔ چاہے سر سے ٹوپی کیوں نہ گر جائے۔ گردن پیٹھ سے کیوں نہ جا لگے پر حسرت تو نہیں رہے گی دیکھنے کی؟ اور پھر سچی بات تو یہ ہے کہ اونچائی پر نظروں کی چڑھائی کر لی۔ یہی بہت ہے۔ لیکن للو اس قسم کے گاہکوں سے کچھ چڑ جایا کرتا۔ کوئی کہے اس کا جاتا ہی کیا تھا بھلا؟ آنے دو آنے کر کے روپوں کا حساب پڑ جاتا تھا اسے۔ خیر وہ بات تو تھی ہی لیکن یہ دیکھ کر للو کے تن بدن میں آنچ ہونے لگتی کہ کم بخت کتے صرف اس کی مٹھائیوں کے لالچ میں اس کی دکان کے سامنے جمع ہو جاتے۔ سوکھے' کھجلی کے مارے گھناؤنے کتے' محض اس کی مٹھائیوں کے شیدائی۔ دینا دلانا کچھ نہیں' اپنی مرجھی آنکھیں اپائے لال ہکا سی زبانیں لڑبڑاتے۔ بس سجی ہوئی مٹھائیوں کو تاکتے ہی رہتے اور للو کا مارے جھنجلاہٹ کے رنگ بدلنے لگتا۔ کچھ بس نہ چلتا تو زور زور سے دھتکارنے لگتا۔ ''دھت دھت' کم بخت نہ کسی کام کے نہ کاج کے'' رات کی رکھوالی کی ہو تو اس بازار میں رات ہی دن تھا۔ چوری چکاری کا امکان نہیں۔ اور اگر گردن کی بات لو تو انگریزی راج ہے۔ کسی کی کیا ہمت ہے جو دکان کے قریب بھی پھٹک جاتا۔ خواہ وہ اور دوسرے تمام دکاندار دن بھر اونگھتے ہی کیوں نہ رہیں پھر اسے فائدہ ہی کیا تھا ان کتوں سے؟ سوائے نقصان کے کیونکہ بعض سفید پوش دکان کے سامنے کتوں کو دیکھ کر ذرا خوف ہی تو کھاتے اور بھئی ان سب باتوں کے علاوہ وہ تھا مٹھائیوں کا مالک۔ اور مٹھائیوں کی تھی قیمت۔ کوئی سستی کوئی مہنگی۔ مگر ہر ایک کی کچھ نہ کچھ قیمت ضرور تھی۔ یہ نہیں کہ کوئی آتا اور مفت مزا لے کر چلتا بنتا۔ لیکن وہ مرجھلے کتے اپنی عمریں اسی بازار میں بتانے کے باوجود قیمت والی بات سمجھتے ہی نہ تھے۔ بس دکان کے سامنے ہی منڈلایا کرتے' دھنسے ہوئے پیٹ دھونکنی کی طرح پھولتے پچکتے' ساری جان سے کپکپا کپکپا کر زبان کی نوک سے لال کے تار باندھا کرتے۔ اور للو تھا کہ آپ ہی آپ سلگتا۔ عاجز تھا

غریب۔ ''ارے یہ کتے!'' وہ دانت بھینچ کر آپ ہی آپ بڑبڑانے لگتا مگر وہ کتے تو کتے.....

سورج غروب ہوتے ہی بازار کی رونق چوگنی ہو جاتی۔ بجلی کی تیز روشنی میں مٹھائیوں پر چپکے ہوئے چاندی کے ورق اور چھجوں کے شوکیس میں رکھے ہوئے چہروں پر جما ہوا پاؤڈر کا غبار ایسا بھلا لگتا کہ بس۔ بازار میں گاہک جیسے امنڈ پڑتے قسم قسم کے گاہک۔ موٹروں پر اڑ کر آنے والے' پیدل رینگنے والے' جیبوں میں نوٹوں کی گڈیاں رکھنے والے اور مٹھی میں چند پیسے دبا کر کسی نچلی دکان پر خریداری کے بہانے کھڑے ہونے والے۔ سب کے پاس قیمت ضرور ہوتی۔ چاہے وہ اونچی دکان پر پہنچنے کے لیے لفٹ کا کام دیتی ہو یا ایک پان اور ایک سگریٹ خرید کر گھنٹوں اسی دکان پر اڈا جمانے کے لیے ہو۔ مگر اس بازار کے گاہکوں کی ایک قسم اور تھی۔ ہڈیوں کے پنجر' جسم پر لتے لگے ہوئے' پلے پھوٹی کوڑی نہیں اور منہ اٹھائے دکانوں کے چکر کاٹ رہے ہیں جیسے کہہ رہے ہوں ہم بھی ضرورت مند ہیں۔ بیوقوف کہیں کے! پھرتے پھرتے تھک جاتے تو پھر کسی نچلی دکان سے لگ کر رال کے گھونٹ حلق سے اتارتے اور اکثر تو ایسا ہوتا کہ للو کی دکان کو اڈا بنا کر اونچائیاں ناپی جاتیں۔ اس پر للو کو کتوں کے ساتھ ساتھ ایسے لوگوں پر بھی غصہ آنے لگتا۔

''شرم نہیں آتی۔ چلے ہیں خالی جیب عشق لڑانے' وہی مثل کہ جسم پر نہیں لتا' پان کھائیں البتہ۔ آخر یہ دکان سجا کر بیٹھنے والی عورتیں۔ پیٹ ظالم ان کا مالک ہے۔ پیٹ جسم بیچتا ہے۔ جب کہیں خود کو پاتا ہے۔'' اور پھر اسے اونچے دکانداروں پر رحم آنے لگتا۔ بالکل ویسے ہی جیسے کتوں کو جمع دیکھ کر اپنے اوپر آتا ہے۔

اکثر تو وہ کتوں جیسی سرشت رکھنے والے' کتوں کی طرح کیں کیں تو نہیں ہاں دانت بھینچ بھینچ کر ایک دوسرے سے کہنے لگتے۔ ''دیکھو ذرا ادھر والی کو۔'' وہ ادھر والی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کوئی موٹی سی گالی ضرور بکتے اور جیسے وہ گالی سیدھی للو کے کلیجے میں برچھی بن کر اتر جاتی۔ وہ اپنی مٹھائیوں پر نظر جما کر کان اسی طرف لگا دیتا اور ادھر سے پڑتیں گالیاں اوپر بیٹھنے والیوں کو۔ ایسی ہے ویسی ہے' کھوسٹ ہے' نکی ہے' چپٹی ہے۔ اور للو اپنے کلیجے پر ہاتھ رکھ کر سوچتا۔ ''انگور کھٹے ہیں۔'' اگر مٹھائیوں کو تاکنے والے کتوں کی سوں سوں اور کیں کیں کا کچھ مفہوم نکالا جائے تو یقینا یہی ہوگا۔ مانا کہ مٹھائیاں دراصل ویسی نہیں ہوتیں جیسی کہ دکھائی دیتی ہیں۔ پھر بھی ان کے بنانے میں کچھ تو لاگت آتی ہی ہے۔ ذائقہ بہت اچھا نہ سہی مگر وقت پر انہیں کھا کر بھوک کی شدت تو کسی قدر کم ہو سکتی تھی۔ بس دونوں قسم کی دکانوں کا یہی حال تھا۔ ورنہ سرے سے یہ بازار ہی نہ ہوتا اور نہ یہ کتے۔

''ذرا بھئی سیر بھر گلاب جامنیں تو دینا'' کوئی بڑے ہی شوقین مزاج لگے بندھے گاہک سینہ تانے دکان پر آن پہنچتے اور للو کو ایسا

محسوس ہوتا جیسے اس کی آمد نے اس کے خیالات کی تائید کردی ہو۔لڑیاں لگے میدے' کھٹے ہوئے اور بناسپتی گھی سے سینچی ہوئی گلاب جامنیں تول کر وہ غرور سے پھول جاتا اور وہ شوقین گاہک جیب کھنکھناتے' خراب گلاب جامنیں لیے کسی نہ کسی زینے پر دندناتے' کسی ردی لیکن سجی سجائی دکان پر پہنچ جاتے۔ پھر للو فاتحانہ شان سے چلا اٹھتا۔

''دھت دھت...... سالے...... کتے۔'' کتے دم دبا کر گردن جھکائے چپکے سے سرک جاتے اور پاس جھنجھی کوڑی نہ رکھنے والے بڑی کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کسی کالی شوکیس پر للچائی نظریں ڈال کر ادھر ادھر ہو جاتے۔ اب للو کو آپ ہی آپ ہنسی آنے لگتی۔ سارے جسم میں زلزلہ سا آجاتا اور وہ بڑے پیار سے اپنی چمچاتی ہوئی مٹھائیوں کے ننھے ننھے ٹیلوں کو دیکھ کر سوچنے لگتا۔ بھلا اس سے فائدہ ہی کیا؟ جانے بوجھتے اڑے رہتے ہیں کم بخت۔ پگلوں کی سمجھ میں آتا ہی نہیں کہ یہاں قیمت سب کچھ ہے' ضرورت کچھ نہیں۔ یہاں سینکڑوں ایسے ہیں جو آئے دن سیروں مٹھائیاں ٹھونستے رہتے ہیں۔ پھر چاہے بدہضمی ہی کیوں نہ ہو جائے۔ او کتے ہی کیوں نہ پھریں۔ ہر جگہ گندگی ہی کیوں نہ پھیلائیں۔ لیکن کسی کو ان پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ قیمت ادا کرتے ہیں۔ اور ایک یہ ہیں پگلے۔ کوئی کیوں مفت ان کی ضرورت کا لحاظ کرتا پھرے؟ چاہے انہیں عمر بھر مٹھائیوں کے لیے ترسنا اور بلکنا ہی کیوں نہ پڑے۔ قیمت نہیں تو کچھ نہیں۔ اور للو یہ سب سوچ کر ٹھیٹ دکاندار بن جاتا۔ اسے ذرہ برابر بھی کتوں سے ہمدردی نہ ہوتی۔ گھوڑا گھاس سے رشتہ محبت جوڑے تو بیچارہ کھائے کیا؟

لیکن ایک دن......

بازار حسب معمول ایک بڑی سی گڑ کی بھیلی کی طرح اپنی جگہ پر تھا' گاہک مکھیوں اور چیونٹیوں کی طرح اس پر چڑھائی کئے ہوئے تھے اور للو اس دن کتوں کو چھری دکھا دکھا کر رعب گانٹھ رہا تھا کہ اتنے میں اس نے اپنے سامنے کی اونچی دکان پر چند ہولناک چیخیں سنیں۔ وہ اپنی گود میں پڑی ہوئی توند اچھال کر حیرت سے کھڑا ہو گیا اور سڑک پر تو جیسے غدر سا پڑ گیا۔ جسے دیکھو بے تحاشا اسی زینے پر چڑھا جا رہا ہے۔ کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ جواب میں اس اونچی دکان کی ایک دکان چھجے پر آکر سینہ کوٹتے ہوئے چلانے لگی۔

''ہائے مار ڈالا...... زہرہ کے چھری جھونک دی۔ ہائے ہائے۔''

اوپر پہنچنے والوں میں سے کسی نے از راہ ہمدردی زہرہ کی بہن کو کمر سے پکڑ کر کرسی پر بٹھا دیا۔ لیکن وہ تھی کہ جیسے چلا چلا کر جان دے ڈالے گی۔ للو کا دل چاہا کہ وہ اوپر جا کر پوری کیفیت معلوم کرے اور کچھ نہیں تو زہرہ کی بہن سلطانہ کو تسلی ہی دے آئے۔ بیچاری کیسی بے حال ہوئی جا رہی تھی۔ لیکن دکان کس پر چھوڑے؟ اسی خیال سے وہ جی مار کر اپنی جگہ پر جما رہا۔

ذرا دیر بعد خون میں لت پت زہرہ ہاتھوں ہاتھ سڑک پر اتاری گئی اور اس کے پیچھے ایک مریل سا وحشی آدمی بھی' جسے کئی مضبوط جوانوں نے دبوچ رکھا تھا۔ بجلی کی تیز روشنی میں زہرہ کے سینے سے ابلتا ہوا خون اور اس آدمی کی آنکھیں اس طرح چمک رہی تھیں کہ للو کا جسم مارے خوف کے سرد پڑ گیا۔ اسے یاد پڑا کہ اس مریل سے آدمی کو اس نے سینکڑوں دفعہ اپنی دکان سے لگے دیکھا تھا جو کہ جیب میں کوڑی نہ رکھنے والے گاہکوں کے گروہ میں سے تھا۔ سلطانہ رو رو کر کہہ رہی تھی۔

''ارے' یہ آیا تو زہرہ باجی سے بلا پیسے کوڑی کے چھیڑ کرنے لگا۔ جس پر زہرہ باجی اسے کوٹھے سے نکالنے لگیں۔ بس اس نے کچھ کہا نہ سنا جھٹ چھری نکال کر مار دی۔ ہے ہے! میری بہن' بیچاری''

زہرہ خوفناک آہنگی سے کراہ رہی تھی اور وہ مریل سا آدمی آنکھیں پھاڑے کڑیل جوانوں کی بانہوں میں جکڑا' اوبی اوبی سانسیں لے رہا تھا۔ مجمع میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں اور اس سرے سے اس سرے تک بیٹھنے والے تاجر سہمے ہوئے تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد زہرہ کو ہسپتال اور اس مریل آدمی کو پولیس چوکی لے جایا گیا۔ مجمع چھٹا تو بازار میں جیسے الو بول گیا۔ ہر شخص چپ۔ للو تو جیسا بیٹھا تھا ویسا ہی بیٹھا رہ گیا۔ نہ اس نے کسی سے کچھ پوچھا اور نہ کسی سے ہمدردی کی' بالکل گم سم۔ ''یہ ننگے بھوکے آدمی اور یہ ہمت'' وہ سوچ سوچ کر حیرت میں غرق ہوا جا رہا تھا کہ سناٹے میں چند کتے پھر اس کی دکان کے سامنے سڑک پر جمع ہو گئے۔ مرجھلے' بھوکے' دھنسے ہوئے پیٹوں والے کتے۔ اور جیسے للو کا دماغ چٹخنے لگا۔ اسے بس یہی معلوم ہوا کہ اب ان کتوں نے دکان پر جست کی اور اب اسے چبایا' اس کے خون کو لال لال کھردری زبانوں سے چاٹا۔ روشنی میں بہت سی چمکتی ہوئی بھوکی آنکھیں۔

''دھت' دھت'' وہ کمزور آواز میں چلایا۔ لیکن کتے نہ سرکے۔ یہ کوئی خلاف معمول بات نہ تھی لیکن آج کتوں کی ہٹ اسے بڑی ہی خطرناک معلوم ہوئی اور اس نے ڈر کر کچھ باسی جلیبیاں سڑک پر پھینک دیں۔ بھوکے ہیں' نہ جانے کیا کر بیٹھیں؟

اس دن سے آج دن تک......

''دھت دھت' لے لے! دھت'' وہ کتوں کو دکان کے سامنے جمع دیکھ کر خوف سے چلاتا اور پھر جانے کیا کچھ سوچ کر بچی کھچی مٹھائیاں ان کے آگے پھینک دیتا۔

''کوئی ایسی صورت ہو جائے کہ دنیا میں سرے سے کتے نہ رہیں تو کیسا اچھا ہو!''

◆◆◆

ہائے اللہ

بیچاری دادی! نہ کسی کے لینے میں نہ کسی کے دینے میں' بس اپنی کوٹھری نما کمرے میں تخت پر بیٹھی موٹے موٹے دانوں والی سیاہ تسبیح کھٹکھٹایا کرتیں۔ تسبیح کھٹکھٹانا تو اب جیسے ان کی عادت ہو گئی تھی۔ کسی سے بات کر رہی ہوں' کسی کو نصیحت فرما رہی ہوں۔ شادی بیاہ پر اظہار خیال ہو یا بیماری غمی کی خبریں سن رہی ہوں۔ لیکن ان کی تسبیح کی گردش جاری رہے گی اور اسی دوران میں برابر کھانس کھانس کر پورے کمرے میں بلغم کے سفید سفید بتاشے بکھیرتی رہتیں۔ دادی کو دنیا میں دو چیزوں سے بڑی محبت تھی۔ تسبیح اور ننھی سے۔ ننھی ان کی یتیم پوتی تھی۔ ویسے تو دوسرے بیٹے سے بھی تین اولادیں تھیں لیکن چونکہ وہ اپنے ماں باپ کے سائے میں پروان چڑھ رہے تھے اس لیے وہ ان کی محبت کے اس قدر مستحق بھی نہ تھے۔ لیکن ادھر کچھ دنوں سے دادی کو دو فکریں شدت سے لاحق تھیں۔ ایک عاقبت اور دوسری ننھی۔

وہ وظیفہ پڑھتے پڑھتے اپنی دھنسی ہوئی سفید سفید آنکھیں ادھر ادھر گھما کر ننھی کو دیکھنا چاہتیں اور جب وہ نظر نہ آتی تو اپنا پوپلا منہ پھاڑ کر چلا اٹھتیں۔ ''ہائے اللہ! جانے کہاں مرگئی؟''

ابھی یہ نعرہ ان کے منہ سے نکل کر گونجتا ہی ہوتا کہ ایک دس گیارہ سال کی تندرست چھوکری گھر کے کسی نہ کسی حصے سے نکل پڑتی۔ چھوٹی سی بل کھائی ہوئی چوٹی' بالکل چوہیا کی دم' گلے میں پھانسی کے پھندے کی طرح پڑا ہوا دوپٹہ' سوکھی ہوئی سلیپریں گھسیٹتی جھپ سے ان کے تخت پر آ بیٹھتی۔

''اری ہرجائی!''

وہ تسبیح کی کھٹ کھٹ کے ساتھ دانتوں سے محروم مسوڑھوں کو بھینچ کر کہتیں اور ننھی سہم کر سوکھا سا منہ بنا لیتی۔

''اتنی سیانی ہو گئی ہے لیکن سمجھ نہ آئی۔'' وہ اس کے بڑھتے ہوئے ڈیل پر اپنی جالے سے دھندلائی آنکھیں گاڑ دیتیں اور ننھی غریب سر جھکا کر جسم چرانے لگتی۔

''یہ دوپٹہ اوڑھا ہے چڑیل نے۔'' ان کی کمزور نظریں اس کے پورے جسم پر اوپر نیچے پھسلنے لگتیں اور وہ جلدی سے اپنی بھاری

بھاری پلکیں جھکا کر دوپٹہ احتیاط سے اوڑھ لیتی۔ بالکل آمنہ آپا اور بڑی اماں کی طرح۔ لیکن فوراً ہی اسے دادی کے سر سے دوپٹہ نہ اوڑھنے اور دوسروں کو ہدایت کرنے پر غصہ آنے لگتا۔

''چل بیٹھ یہاں' خبردار جو اٹھی' ٹانگ توڑ دوں گی مردار کی۔'' وہ دھمکا کر مزے سے اپنی تسبیح سے شغل فرمانے لگتیں اور ننھی زیر لب بدبداتی تخت کے ایک کونے میں سمٹ کر دادی کو جلتی ہوئی نظروں سے گھورا کرتی۔ اسے رہ رہ کر کسی کھیل کے ادھورے رہ جانے یا کسی بات کو پورا نہ سن سکنے کا خیال ستانے لگتا اور وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگنے لگتی۔ اللہ کرے دادی کو نیند آ جائے تو وہ جھٹ آمنہ آپا کے پاس بھاگ جائے۔ لیکن توبہ! کہیں دادی جان کو دن میں نیند آ سکتی تھی۔ وہ جوں کی توں پوپلے پیٹ پیٹ کر وظیفہ پڑھنے کی مشقت کی رال کی پھواریں اڑایا کرتیں' اور ننھی کا جی لوٹ لوٹ کر رہ جاتا۔ لیکن دادی اسے پاس بٹھا کر اطمینان سے اپنی تسبیح اس طرح کھٹکھٹایا کرتیں جیسے کوئی غصے میں دانت کٹکٹاتا ہو۔

گرمیوں کی چاندنی رات' سب لوگ کھانے پینے سے فارغ ہو کر لیٹے بیٹھے تھے اور دادی عشاء کی نماز ادا کر رہی تھیں۔ ننھی لیٹے لیٹے اکتا کر اٹھی اور آمنہ آپا کے پاس جا پہنچی۔ آمنہ آپا تھیں بڑی کھلنڈری' عمر بھی کوئی سولہ سترہ سال کی لیکن انہیں لڑکوں کی طرح اچھل کود پھاند کے کھیلوں میں خاص مزا آتا۔ ہنسوڑ ا ایسی کہ بے بات کی بات پر کھلکھلا رہی ہیں۔ شاید یہی خوبیاں تھیں کہ ان سے بچے بڑے خوش رہتے۔

''آمنہ آپا! ابھی دل گھبرا رہا ہے ہمارا'' ننھی نے ٹھنک کر آمنہ آپا کا ہاتھ کھینچا ''تو آؤ کچھ کھیلیں'' آمنہ آپا تو جیسے تیار ہی بیٹھی تھیں۔ جھٹ شلوار کے پائنچے چڑھا کر کھڑی ہو گئیں۔

''ہاں ہاں چھپی چھپول ہو گی۔'' ننھی کھل اٹھی۔ ''صلو بھیا اور ریاضو سے بھی کہو آمنہ آپا''

صلو بھیا اور ریاضو کو کھیل سے کب انکار تھا۔ چاروں گھیرا بنا کے کھڑے ہوئے اور صلو بھیا نے اکڑ بکڑ شروع کی۔

''اکڑ بکڑ بمبے ...... '' انہوں نے ہر ایک کے سینے پر انگلی سے ٹھونگیں دے دے کر کہنا شروع کیا۔ لیکن آج جیسے ہی ان کی انگلی ننھی کے سینے کی طرف بڑھی' ویسے ہی ننھی کو دادی کی گہری گہری نظریں اپنے سینے پر چبھتی ہوئی معلوم ہونے لگیں اور اس نے بالکل غیر ارادی طور پر اپنے گلے میں پڑا ہوا دوپٹہ سینے پر کھینچ لیا۔ صلو بھیا کی انگلی اٹھی کی اٹھی رہ گئی اور وہ اس چھوٹی سی لڑکی کی اتنی بڑی سی حرکت پر بھوچکے رہ گئے۔

کھیل شروع ہوا۔ ننھی چور بنی۔ ریاضو' آمنہ آپا اور صلو بھیا کے آنگن کے بچھے ہوئے پلنگوں کو اپنے اور ننھی کے درمیان حد فاصل

رکھا۔ننھی پکڑنے دوڑی اور مچ گئی دھما چوکڑی۔ کسی نے جھکائی دی' کسی نے چکر۔اے لو! وہ تگڈم دوڑا اور دھپک کے قریب پہنچا۔ننھی انہیں پکڑنے کے لیے پلٹی ہی تھی کہ کسی نے اس کی چوٹی پکڑ کر گھسیٹا۔اس نے جو مڑ کر چوٹی پکڑنے والے کو دیکھا تو دادی سر پر سوار تھیں۔غریب کے چھکے چھوٹ گئے۔

''ہائے اللہ! اس کمینی ہڑونگی کا کیا کروں؟'' دادی نے تڑ سے اس کے منہ پر چانٹا رسید کیا اور وہ چکرا کر زمین پر بیٹھ گئی۔آنکھوں کے سامنے جیسے چراغ کی لوسی ابھری اور پھر اندھیرا چھا گیا۔

''ارے کیا بات ہے دادی؟'' صلو بھیا نے دوڑ کر دادی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''جا تو رہنے دے' آ گیا دادی کا سگا'' دادی کی جالے سے منڈھی ہوئی آنکھیں چاندنی میں بڑی بھیانک معلوم ہو رہی تھیں۔

''ہٹ آؤ صلو! ننھی انہی کی سب کوئی ہے ہماری تو کچھ نہیں لگتی۔'' بڑی اماں کو دادی سے لڑنے کا موقع ہاتھ آ گیا' وہ تو ویسے ہی دادی سے خار کھاتی تھیں۔

''وہ آخر یہ بھی کوئی بات ہے کہ انھیں اور دھوں دھوں پیٹ دیا۔'' صلو بھیا کو واقعی حیرت تھی کہ دادی کو اچانک یہ کیا سوجھی اور ادھر ننھی کا مغموم دل اس بروقت باز پرس سے کھل اٹھا۔کوئی تو ہے آڑے وقت کا ساتھی۔لیکن دادی یہ سن کر ایک دم بپھر گئیں۔

''تو مجھ سے پوچھنے والا کون ہوتا ہے۔دیکھ آ نے تو دے اپنے باپ کو' فیصلہ کروں گی۔ہائے! خدا کی شان ہے کہ مجھے ننھی پر بھی اختیار نہ رہے۔اتنی بڑی لڑکی اور یوں اچھل پھاند کرے۔اس پر اگر میں منع کروں تو اپنی ماں کا لاڈلہ چھاتی پر چڑھنے دوڑے۔سب مل کر لونڈیا کو خراب کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔''

بڑی اماں تو بھری بیٹھی تھیں۔ننھی کو خراب کرنے کا سنگین الزام جو سنا تو بھبھک گئیں۔بات میں بات بڑھتی گئی۔یہاں تک کہ دادی نے ہار کر ننھی کی کندی بنائی تو بنائی خود کو بھی پیٹ لیا۔

رات گئے تک ننھی اپنے کھٹولے پر اوندھی پڑی سسکیاں بھر بھر کر یہی سوچتی رہی کہ آخر دادی کو خاص کر اسی سے جلن کیوں ہو گئی ہے۔پہلے بھی تو آخر وہ یہی ننھی تھی جو اک ذرا دیر بھی چپ بیٹھتی تو دادی دھکیل دھکیل کر کھیلنے جانے کو کہا کرتی تھیں۔اور اب یہ عالم کہ جہاں دادی کے کولہے سے کولہا بھڑا کر نہ بیٹھی۔ان کے کلیجے میں ہوکیں اٹھنے لگیں۔جانے دادی کو اب اس سے نفرت کیوں ہو گئی ہے۔

صبح اٹھ کر ننھی نے جو دیکھا تو دادی کا منہ بری طرح پھولا ہوا تھا۔سامنے ناشتہ آیا تو دادی نے منہ پھیر لیا۔بیٹے نے سلام کیا تو

بلائیں لینے کی بجائے پیٹھ موڑ لی اور ننھی کی طرف تو آنکھ اٹھا کر دیکھا بھی نہیں۔بس اپنا تخت اور تسبیح ...... باقی سب سے گویا انہیں نفرت ہو گئی تھی۔لیکن ننھی بھی دادی کی خوشنودی حاصل کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ایک منٹ کے لیے بھی سامنے سے نہ ٹلی۔آخر دوپہر ڈھلے ان کا غصہ بھی ڈھلا۔اشارے سے ننھی کو اپنے پاس بلایا۔ننھی خوش خوش ان کے قریب جا بیٹھی۔

''دیکھ ننھی! اگر تو میرا کہنا نہ مانے گی تو میں تیرا منہ نہ دیکھوں گی۔''

''دادی! میں تو تمہاری ہر بات مانتی ہوں۔''

''تو صلو کے پاس نہ بیٹھا اٹھا کر اور نہ اس سے بات ہی کیا کر۔''

''کیوں؟'' ننھی اس نئے حکم سے چونکی۔کیونکہ گھر بھر میں صلو بھیا ہی تو اس کے سب سے زیادہ طرفدار تھے۔

''سیانی لڑکیاں' لڑکوں سے الگ رہتی ہیں۔'' دادی نے گویا ایک بڑا راز کہہ ڈالا۔

''تو میں سیانی ہو گئی ہوں؟'' ننھی واقعی اس وقت بہت سنجیدگی سے اپنے متعلق فیصلہ سننا چاہتی تھی۔

''ہشت'' دادی اس وقت اعتراف کرتے ہوئے ڈر رہی تھیں کہ کہیں یہ بیوقوف لڑکی یہ بھی نہ پوچھ بیٹھے کہ سیانے ہونے کا مطلب کیا ہے۔انہیں فوراً ہی اپنا بچپن یاد آ گیا جب وہ اپنی اماں کے اشارے سے سب کچھ سمجھ جایا کرتی تھیں۔اور تو اور سات برس کی عمر سے اتنے ڈھنگ سے دوپٹہ اوڑھتی تھیں کہ گھر میں آنے جانے والیاں شادی کے پیام لانے کی فکر کرنے لگی تھیں اور ایک یہ ہے ننھی۔

دادی کی خاموشی نے ننھی کے دماغ میں ایک ایسا سوال اٹھا دیا جو اس کے خیال سے دادی کو چت کر دینے کے لیے کافی تھا۔

''تو پھر آمنہ آپا' صلو بھیا کے ساتھ کیوں کھیلتی ہیں؟ انہیں کیوں نہیں روکتیں؟ بس میرے ہی پیچھے پڑی رہتی ہو۔'' مارے جوش کے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

''چڑیل!'' وہ بڑے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔''وہ کھیلیں' وہ ان کی سگی بہن ہیں۔''

''اور میں؟''

''تو چچازاد بہن ہے۔''

''تب تو ہم دونوں بہنیں ہی ہیں ان کی۔'' ننھی کو چچازاد بہن اور سگی بہن میں کچھ زیادہ فرق نہ معلوم ہوا۔

''اری' وکیل کی بچی! تجھے دلیلیں چھانٹنا بہت آتی ہیں۔بس میں نے کہہ دیا' آمنہ کا جو دل چاہے کرے مگر تو نہ کر۔اسے کوئی کچھ نہ کہے گا لیکن تجھے سب تھوکیں گے۔''

"اچھی دادی! بھلا کیوں تھوکیں گے مجھے؟" ننھی کی رگ تجسس پھڑکی۔

"چل مردار چڑیل" دادی نے اس کے تابڑ توڑ سوالات سے بھنا کر ایک دو ہتڑ رسید کر دیا۔ اور ننھی نے بجائے رو دینے کے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"اچھا! اب میں صلو بھیا کے پاس نہ بیٹھوں گی مگر اب تم مجھ سے ناراض نہ ہونا۔"

اس وقت تو صلو بھیا سے نہ ملنے کا رنج سیانے ہونے کی خوشی کے باعث ماند پڑ گیا۔ ایک عجیب سی خوشی کہ وہ سیانی ہو رہی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کے دماغ پر ایک نامعلوم سا بوجھ بھی تھا۔ جس کے نیچے سینکڑوں سوالات سڑے پھل کے مکروہ کیڑوں کی طرح کلبلا رہے تھے۔

دو تین روز تک تو سیانے ہونے کا نشہ اسے سب کچھ بھلائے رہا۔ لیکن پھر تنہائی کی ترشی نے اسے نشے کو ہلکا کر دیا۔ جب صلو بھیا اس کے سامنے سے آتے جاتے تو اس کا دل مچل جاتا کہ وہ ان سے بولے' بات کرے اور ان سے یہ بھی کہہ دے کہ "اچھے صلو بھیا! دادی کہتی ہیں کہ تم سیانی ہو رہی ہو۔ اس لیے صلو سے نہ بولا کرو۔ ورنہ میرا دل تو بہت چاہتا ہے تم سے بولوں۔"

لیکن صلو بھیا بھی کچھ ناراض سے تھے یعنی گردن اکڑائے' بغیر اس کی طرف دیکھے شان سے گزر جاتے۔ جیسے اب انہیں اس کی کوئی پروا نہ رہی تھی۔ یہ دیکھ کر ننھی کا دل بہت جلتا۔ لیکن وعدہ!

ایک دن بڑے سویرے ہی ننھی کی آنکھ کھل گئی۔ دادی کمرے کے اندر اپنے تخت پر نماز ادا کر رہی تھیں۔ باقی سب لمبی تانے تھے' اچانک اس کے دل میں آئی کہ لاؤ اس وقت صلو بھیا کو جگا کر وہ سب کہہ دے جس کو سن کر وہ اسے بے قصور سمجھیں۔ وہ ادھر ادھر دیکھ کر ننگے پاؤں اٹھ کر ان کے پلنگ تک گئی اور اس نے ان کے چہرے پر سے چادر الٹ دی۔ اتنی چوری سے انہیں دیکھا تو وہ اسے بہت ہی بھلے معلوم ہوئے۔ اجڑے اجڑے بال' اوپر کے ہونٹ پر ریشمی روئیں اور ان پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں۔ اسے پسینے سے بڑی گھبراہٹ ہوتی تھی۔ خواہ اس کے نکلے یا کسی دوسرے کے۔ اس نے جھٹ اپنے میلے دوپٹے سے ان کا پسینہ خشک کرنا شروع کر دیا۔ وہ جاگ پڑے اور ننھی کو اتنے سویرے اپنے پاس دیکھ کر حیران رہ گئے۔ انہوں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا اور اچانک اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ پھر چادر سے اپنا منہ چھپا کر کروٹ بدل لی۔ ننھی نے مڑ کر کمرے کی طرف دیکھا' دادی سلام پھیر رہی تھیں۔ اس کی سمجھ میں فوراً آ گیا کہ صلو بھیا نے منہ کیوں چھپا لیا۔ وہ جھپٹ کر اپنے کھٹولے پر لیٹ گئی۔ دل اس چوری کی حرکت پر دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ توبہ! یہ وہی صلو بھیا تو تھے جن کے ساتھ گھنٹوں تنہا کمرے میں بیٹھ کتابوں کی کہانیاں سنی تھیں۔ جن کے کندھوں پر چڑھ کر بازاروں میں

گھومی تھی لیکن آج دادی کی ہائے ہائے نے اس کی معصوم حرکتوں کو کتنا سنجیدہ بنا دیا تھا۔

"ہائے اللہ!" دادی تسبیح کی کھٹا کھٹ کے ساتھ چلاتیں۔ "ہر وقت پڑی ہے مسٹنڈی! اری تجھے کوئی کام نہیں کرنے کو۔"

ادھر کچھ دنوں سے یہ نئی آفت اٹھ کھڑی ہوئی تھی کہ دادی اسے خاموش لیٹا بیٹھا بھی نہیں دیکھ سکتی تھیں۔

"کیا کریں پھر؟" وہ دادی کا ہر روز گرگٹ کی طرح بدلتا ہوا رنگ دیکھ کر بہت زرد اور مضمحل ہو گئی تھی۔

"اری میرے پھٹے ہوئے کرتوں میں کھونپیں ہی بھر دے۔" دادی اس پر احساس جوانی کا بوجھ لاد کر یہی سمجھتی تھی کہ خالی پڑے رہنے سے شیطان پاس آتا ہے اس لیے عقلمندی اسی میں ہے کہ زیادہ سے زیادہ بوجھ لاد دو تا کہ دھیان ہی نہ بھٹکے لیکن بیچاری دادی کو یہ معلوم ہی نہ تھا کہ زیادہ مار جسم کو بے حس کر دیتی ہے اور پھر وہی مار ایک معمولی بات ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہی حال ننھی کا ہوا۔ ہر وقت کی "ہائے اللہ" سنتے رہنا اس کی عادت ہو کر رہ گئی۔ پہلے تو وہ اپنے وعدے کا لحاظ کرتے ہوئے صلو بھیا کو نیچی نیچی نظروں سے دیکھنے پر اکتفا کر لیتی تھی۔ لیکن اب دادی کی بڑھتی ہوئی بے اعتمادی نے اسے ضدی بنا دیا اور وہ دادی کے کولہے سے کولہا بھڑا کر صلو بھیا اور ریاضو کو گھورنے لگی۔ وہ کھانے پینے اور پیسے مانگنے کے بہانے پہروں دادی سے الجھی۔ انہیں چپکے چپکے کوستی اور دل ہی دل میں ان کی گالیاں دہراتی۔ اسے اب دادی سے سخت نفرت اور ضد ہو گئی تھی۔ اس پر آمنہ آپا کا بھائیوں میں گھل مل کر بیٹھنا اور بھی چنگاریوں پر لٹا دیتا تھا۔

ادھر ایک ماہ سے تو دادی نے اسے آمنہ آپا سے بولنے چالنے کو بھی منع کر دیا تھا۔ کیونکہ آمنہ آپا نے ایک دن محض دادی کو جلانے کے لیے ساری کو سمیٹ کر لنگوٹ کی طرح کسا اور اپنی موٹی موٹی رانیں خوب ہی تو بجائیں بالکل پہلوانوں کی طرح۔ بڑی اماں تو مسکرا کر چپ ہو گئیں لیکن دادی نے جو یہ رنگ دیکھا تو خدا یاد آ گیا۔ ان کے خیال سے آمنہ آپا ہاتھ سے نکل چکی تھیں اور ایسی لڑکی کے ساتھ وہ ننھی کو کیسے دیکھ سکتی تھیں؟ اب ننھی تھی اور دادی کا سوکھا مرنڈا ساتھ۔

ننھی کی سمجھ میں یہ اب بھی نہ آیا تھا کہ وہ سیانی کیونکر ہو گئی ہے؟ اس کی ہم عمر لڑکیاں تو ابھی تک لڑکوں کے ساتھ مکتب میں پڑھتی تھیں۔ وہ تو کہو' اسے پڑھنے سے دلچسپی ہی نہ تھی۔ ورنہ ابھی تک مکتب میں پڑھتی ہوتی۔ لیکن اس معصوم بچی کو کیا معلوم تھا کہ دادی ان لوگوں میں سے تھیں جو ہر بیمار کو قریب المرگ سمجھ کر ہائے ہو کر کرتے ہیں لیکن جب واقعی وہ بیمار مایوس ہو کر مر جاتا ہے تو ان کی آنکھیں ریگستان کی طرح خشک ہو جاتی ہیں۔

گرمی کی دوپہر! ہر طرف سنسان خاموشی۔ اتفاق کی بات کہ دادی معہ اپنی تسبیح کے سو رہی تھیں اور ننھی اپنے کھٹولے پر پسینے میں

شرابور پڑی جانے کیا کیا سوچ رہی تھی۔ دادی کی روک ٹوک نے اس کے معصوم احساسات کو یکسر سنجیدہ اور تجسس آمیز بنا دیا تھا۔ اس کے دماغ میں بیک وقت سینکڑوں سوالات کھٹولے کی پھانسوں کی مانند چبھ رہے تھے اور جن کے جوابات وہ کسی نہ کسی سے مانگ کر اس خلش سے نجات چاہتی تھی۔ آخر اسے صلو بھیا سے بات چیت کرنے کو کیوں منع کیا گیا ہے؟ اس ایک سوال کے گرد اس کے کل احساسات گھوم رہے تھے۔

اس نے ایک بار پھر دادی کی طرف دیکھا جو بے خبر سو رہی تھیں۔ چلو صلو بھیا سے ہی پوچھیں۔ وہ بڑے اچھے ہیں۔ وہ اس کی باتوں پر ہنسیں گے نہیں۔ آمنہ آپا تو پکی ہنسوڑ ہیں۔ بس کھل کھل کرنے لگیں گی۔ وہ یہی سوچ کر اپنے کھٹولے سے اٹھی اور ننگے پاؤں آنگن میں نکل آئی۔ اچانک اندھیرے سے دھوپ میں آنے کے باعث اس کی آنکھیں چندھیا گئیں اور تلوے جلتی ہوئی زمین پر جھلسنے لگے۔ وہ آہستہ آہستہ کبھی پنجوں اور کبھی ایڑیوں کے بل چلتی ہوئی صلو بھیا کے کمرے کی طرف بڑھی۔ ہولے سے بھڑے ہوئے کواڑ کھولے اور اندر داخل ہو گئی۔

صلو بھیا سو رہے تھے۔ وہی بکھرے بکھرے بال اور پسینے میں بھیگی ہوئی مسیں۔ وہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ان کے پلنگ کی پٹی پر ٹک گئی۔ اتنے دنوں بعد چوری چھپے ان کے پاس آ کر اس کی حالت عجیب سی ہو گئی۔ اسے ان کی وہ تمام ہمدردیاں یاد آ گئیں اور پھر دادی کے امتناعی احکام۔ اس کا دل بھر آیا اور اس نے اپنا سر ان کے سینے پر رکھ دیا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس سے صلو بھیا ہمدردی کریں۔

صلو بھیا جاگ پڑے۔ وہ ننھی کو اتنی روک ٹوک کے باوجود اپنے سینے پر جھکا دیکھ کر اسے ننھی سی ننھی نہ سمجھے بلکہ ایک عورت.... جو کسی کی انگلی اپنے سینے کی طرف بڑھتے دیکھ کر جسم چراتی ہے۔ جو کسی کو نیچی نیچی نظروں سے دیکھتی ہے۔ جو تنہائی میں کسی کی مسوں کا پسینہ پونچھنے سے بھی نہیں چوکتی اور جو دوپہر کے سناٹے میں جذبات سے مغلوب ہو کسی کے دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کرتی ہے۔

صلو بھیا کی عقل پر دادی کے قبل از وقت اندیشوں نے پردہ ڈال دیا۔

''ہائے اللہ'' دادی نے صلو بھیا کے کمرے میں ہانپتے ہوئے قدم رکھا اور جونہی اپنی چندھیائی آنکھیں کمرے کی نم آلود تاریکی میں کھولیں تو ہائے اللہ کا زوردار نعرہ ان کے پوپلے منہ میں پھڑ پھڑا کر رہ گیا۔

زمین سے بہت اونچائی پر ہوا میں تیرتی ہوئی کسی چیل نے چچیا کر دادی کو آنکھیں میچ کر لاحول پڑھنے کی یاد دلا دی۔

◆◆◆

بندر کا گھاؤ

وہ برآمدے میں جھلنگی کھاٹ پر نئی دلہن کی طرح گٹھڑی بنی پڑی تھی۔ گرمی کی بھری دوپہر اس پر ٹھہرا ہوا بخار۔ جی بولایا جا رہا تھا۔ کمرے میں گھر کے سب افراد دروازے بند کئے آرام سے ہنس بول رہے تھے۔ کئی بار اس کا جی چاہا کہ وہ بھی سورج کی تپش سے پناہ لینے کے لیے کمرے میں جا پڑے۔ لیکن اس کو ڈر تھا کہ کہیں اسے دیکھتے ہی کڑوی نصیحتوں کی بوتلیں نہ کھل جائیں۔ اس لیے وہ سورج کی تپش اور بخار کی حالت میں بھی اس تھوڑی سی تنہائی کو غنیمت سمجھ رہی تھی۔ تیز دھوپ اور تیز بخار۔ اسے رہ رہ کر ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی ہڈیوں کا گودا پگھل گیا ہے اور اس میں اس کی نس نس تلی جا رہی ہے اور اس کی کمانوں کی طرح ابھری ہوئی پسلیوں کو ایک مضبوط ہاتھ جھاڑو کی سینکوں کی طرح توڑ مروڑ دینا چاہتا ہے۔ اس عجیب احساس سے اسے کھانسی آنے لگی۔ وہی کھانسی اس طرح جیسے کوئی لکڑی کے گھنے ہوئے خالی صندوق کو دھپ ہو جائے! کھانستے کھانستے اس کے حلق سے کوئی چیز امنڈ آئی اور اس نے لیٹے لیٹے کھاٹ کے ڈھیلے بانوں کو سرکا کر تھوکا۔ جمے ہوئے خون کا ایک چھوٹا سا لوتھڑا چپ سے زمین پر چپک گیا اور اس سے پہلے کہ وہ خون کو دیکھ کر کچھ سوچتی بندروں کے خوخیانے کی آواز سن کر بے حس و حرکت پڑ گئی۔ کیونکہ اسے بندروں سے بہت خوف معلوم ہوتا تھا۔ اس نے بغیر گردن موڑے آنکھیں گھما کر اس طرف دیکھا جدھر سے آواز آ رہی تھی۔

ہائے اللہ ...... اس کے پپڑیائے ہوئے ہونٹوں کو اور بھی جھلساتا ہوا نکلا' افوہ! کتنے بہت سے بندر باورچی خانے کی پچھواڑے والی نیم سے دھپا دھپ چھت پر الٹی سیدھی چھلانگیں لگا رہے تھے۔ اس کا دل ایک دم چاہا کہ وہ بھاگ کر کمرے میں گھس جائے۔ لیکن اس ڈر کے مارے وہ حرکت نہ کر سکی کہ کہیں یہ سب بندر اس پر ٹوٹ نہ پڑیں۔

کائی سے کالی منڈیر پر ایک مرجھلا سا بندر پڑا سسک رہا تھا اور اس کے ارد گرد کئی موٹے موٹے بندر بیٹھے اس کی پیٹھ کے سیاہ گھناؤنے گھاؤ کو اپنے تیز ناخنوں سے کرید رہے تھے۔ بندر کا مکروہ گھاؤ دیکھ کر اسے پھریریاں آنے لگیں اور بندر تھے کہ زخم کے معائنے میں پوری طرح منہمک' ابھی ایک گھاؤ میں ہاتھ گھنگھول رہا ہے کہ دوسرا کھیسیں نکالتا' پوپٹے پیٹتا' وہی عمل شروع کر دیتا۔ گویا ایک زخمی اور سینکڑوں جراح۔ اور وہ بیچارہ مرجھلا بندر تھا کہ مارے تکلیف کے سر ڈھلکائے دیتا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ بس اب مرا'

اب مرا۔ وہ سوچنے لگی کہ یہ کم بخت یہاں سے بھاگ کیوں نہیں جاتا؟ بھلا اس طرح اپنے گھاؤ کا معائنہ کراتے کراتے جان دینے سے حاصل؟ لیکن بے عقل جانور! پھر بھی اسے اس مظلوم بندر کی بیکسی پر بڑا رحم آ رہا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ کسی طرح ان دھوں دھوں بندروں سے اس کا پیچھا چھڑا دے جو ہمدردی کے بہانے تماشہ دیکھ رہے ہیں لیکن..... لیکن یکلخت اس کی کمزور پسلیوں پر کوئی مضبوط ہاتھ زور آزمائی کرنے لگا۔ کھانسی اور سینے سے لے کر حلق تک گدگدی۔ اس کا منہ اس طرح بھر گیا جیسے اس نے بیک وقت پان کی کئی گلوریوں کی پیک اکٹھی کر لی ہو۔ اس نے گھبرا کر تھوکا۔ ہی ای ای..... سرخ سرخ جیتا ہوا خون' ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے اور وہ اپناد ھمکتا ہوا سر پھانسوں بھری کھاٹ پر رگڑنے لگی۔

بندر خوخیا رہے تھے اور کمرے میں گھر کے لوگ اس کے یوں الگ تھلگ رہنے پر باتیں بنا رہے تھے۔ اس نے بیزار ہو کر اپنی ڈھیلی ڈھیلی ٹانگیں پسار کر پٹی سے اڑا لیں اور دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لیے۔ اسکے کانوں میں گھر والوں کے بڑبڑانے اور بندروں کے خوخیانے کی آوازیں لوہے کی گرم گرم سلاخوں کی مانند اترتی معلوم ہو رہی تھی۔ بندر اور گھر والے کتنے ہم آہنگ ہیں۔ اسے خیال آیا اور اسے اپنے سارے جسم میں نبضوں کی پھڑک محسوس ہونے لگی۔ معاً جیسے اس سے کسی نے کہہ دیا ہو کہ تو بھی اس مرجھلے بندر کی طرح ہے جو جانتے بوجھتے مہلک بیماریوں کا شکار ہو رہی ہے اور پھر بطور دلیل اس کے دھکتے ہوئے دماغ پر کچھ زمانہ قبل کی کئی انمٹ تصویریں ابھر آئیں۔

''تئیس چوبیس برس کی جوان پچھتی آنکھوں میں نہیں سماتی اب تو۔'' ماں کچھ جل کر فکر مند لہجے میں کہہ اٹھتی اور اسے اپنے پہاڑ جیسے کنوارپنے کا بہت احساس ہونے لگتا۔ اس کے خاندان کی ہم عمر لڑکیاں بلکہ اس سے بھی کم سن لڑکیاں کتنے ہی سال ہوئے بیاہی جا چکی ہیں۔ کئی کے چار چار پانچ پانچ بچے بھی ہو چکے تھے۔ کئی اپنے شوہروں کی نظر میں پرانا گھسا ہوا مال ہو کر میکے میں پڑی تعویذوں اور پیر صاحبان کے عملیات تک کے ذریعے اپنی پھٹی پرانی جوانیاں رفو کرا رہی تھیں۔ لیکن ایک وہی نہ جانے کیسی قسمت لے کر آئی تھی کہ اب تک اس اچھوتی بیری پر کسی نے ڈھیلا پھینکنے کی زحمت نہ گوارا فرمائی۔ صورت شکل کی کہو تو ایسی بری بات بھی نہ تھی۔ بڑی سگھڑ اور بے منہ کی لڑکی تھی۔ اتنی بات ضرور تھی کہ سوائے اس کے اور اس کی ماں کے کسی کو اتنی فکر نہ تھی۔ باپ تھا تو اس کو صرف پڑے پڑے حقہ پینے اور ہر دوسرے سال ایک عدد بچے کے اضافہ پر فخر کرنے کے علاوہ تیسرا کام نہ تھا۔ بڑا بھائی سو اپنی فکر میں مگن۔ آج دھوبن پر عاشق تو کل مہترانی پر فدا۔ اور چپکے چپکے بھی نہیں۔ کھلم کھلا' جوان بہن کے سامنے آہیں بھرنے' چٹخارے لینے اور جا و بیجا کھجانے سے بھی نہ چوکتا۔

تو وہ کچھ ایسے ماحول میں سانس لے رہی تھی۔ ماں نے اس کی بھرپور جوانی کو خانہ داری کی سل کے نیچے بہت دبانا چاہا لیکن توبہ۔ ایک وقت ہوا کرتا ہے۔ جب سوپ کا الارا سوپ میں نہیں رہتا۔ آپ نے کبھی چولہے پر پکتی ہوئی دال تو دیکھی ہی ہوگی۔ اور یہ بھی دیکھا ہوگا کہ جس وقت ابال آتا ہے تو ہنڈیا دیکھنے والا جلدی سے پتیلی کا ڈھکنا ہٹا دیتا ہے۔ اس طرح ابال میں کچھ کمی آ جاتی ہے نا؟ اور اگر غلطی سے ڈھکنا نہ ہٹایا جائے تو ابال اسے خود بخود اچھال کر اپنے لیے راہ پیدا کر لیتا ہے۔ غلط تو نہیں؟ ہاں تو اس کی زندگی میں بھی ابال کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ حیا کے بوجھ سے جھکی ہوئی آنکھیں کچھ ڈھونڈنے کے لیے ادھر ادھر اٹھنے لگیں۔ ویسے تو پڑوس کا مکان عرصے سے خالی پڑا تھا۔ لیکن ادھر سنا کہ کوئی طالب علم آ رہا ہے۔ بس کیا تھا؟ زمین کے پیٹ میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے لاوے کو پھوٹ پڑنے کے لیے زمین کی کمزور پرت مل گئی۔ کام کاج کرتے کرتے اس کی نظریں اس دیوار کی طرف اٹھ جاتیں۔ جس کے پیچھے کوئی چلتا پھرتا ہوا رہتا ہوگا۔ اس کی خود فراموشیوں پر ماں گالیاں کوسنے دے رہی ہوتی۔ لیکن اس کے کانوں کے پردے وہ بھاری سی اجنبی آواز اپنے میں جذب کرنے کے لیے پھڑ پھڑاتے رہتے۔ گھر میں ماں باپ آپس میں جھگڑتے ہوتے اور وہ خیال ہی خیال میں دیوار پار کر کے کسی کے پہلو سے جا لگتی۔ لاوا جو تھا۔ بس اندر ہی اندر جوش کھا رہا تھا۔

''کوٹھے پر کیوں جا رہی ہے؟'' بڑا بھائی بڑا ماہر نفسیات۔ اس کے ہاتھ میں رنگا ہوا گیلا دوپٹہ بھینچ کر رہ گیا۔

''دوپٹہ سکھانے'' اس کی تیوری پر بل آ گئے۔ بھوکے کے سامنے سے تھالی سرکائی جائے اور اسے غصہ نہ آئے۔

''کیا یہاں دھوپ نہیں ہے جو اوپر جانے کی ضرورت ہوئی؟'' اس نے ایک باغیرت بھائی کی طرح اسے جلتی ہوئی نظروں سے گھورا اور پھر ایک گھٹیا قسم کی سگریٹ سلگائی۔ وہ بدبداتی ہوئی دوپٹہ پلنگ پر پھینک کر بیٹھ رہی۔ بھائی مطمئن ہو کر گنگنانے لگا۔

''نینوں میں نینا ڈالے ہو بانکے نینا والے''

اور وہ چڑ کر دل ہی دل میں کوسنے دینے لگی۔

ادھر دیکھا' ادھر دیکھا۔ کوئی بھی اس کے شوق میں حارج نہ تھا۔ افوہ! کتنے دن سے وہ اس سوراخ سے جھانکنے کی متمنی تھی۔ اس نے موقع پا کر جلدی سے اپنی آنکھ اس ننھے سے سوراخ سے لگا دی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک گورا چٹا سا چہرہ سامنے آیا اور جھپ سے گزر گیا۔ ایک جھلک صرف ایک۔ اس کا اضطراب اور بڑھ گیا۔ کاش! ایک بار وہ اور سامنے آ جائے۔ وہ اپنی آنکھ سوراخ سے لگائے رہی۔ کم بخت سوراخ بھی تو ایسی جگہ تھا کہ نہ تو پوری طرح بیٹھ کر جھانکا جا سکتا تھا اور نہ بالکل کھڑے ہی ہو کر۔ بس اس پر بالکل رکوع کی سی کیفیت طاری تھی۔ دونوں ہاتھ گھٹنوں پر' آنکھ سوراخ پر اور کان کمرے کے دروازوں پر۔ جھکے جھکے کمر دکھ گئی۔ ہاتھ سن پر گئے

اور کئی بار تو پلکوں کی رگڑ سے دیوار کی مٹی جھڑ کر آنکھ میں گھس گئی لیکن وہ اسی طرح اس سوراخ سے چمٹی رہی اور اس سے عجیب عجیب امنگیں لپٹی رہیں۔

ایک دن' دو دن' تین دن...... مہینوں اس ننھے سے سوراخ سے اس کی نظر کے ساتھ ساتھ جسم نے بھی پار ہو جانا چاہا لیکن تھک کر اسے یقین آ گیا کہ یہ ناممکن بات ہے۔

''اماں!'' اس کا چھوٹا بھائی دھما دھم زینے سے اتر رہا تھا۔ ''سالے نے میری پتنگ کاٹ لی۔''

''اے کس نے بیٹا؟'' ماں کے چھکے چھوٹ گئے۔ یعنی ابھی کل ہی تو انہوں نے اسے چار پیسے کی پتنگ منگا کر دی تھی۔ اور وہ بھی کٹ گئی۔

''وہی جو ادھر آ کر آ رہا ہے۔ کہہ رہا تھا کوٹھے پر پتنگ نہ اڑایا کرو۔ گر پڑو گے نیچے۔'' وہ مارے غصے کے پاؤں پٹخے جا رہا تھا۔

''تو کیا برا کہا؟'' وہ آٹا گوندھتے گوندھتے رک کر بولی۔

''چل تو چپکی بیٹھی۔'' ماں نے اسے پھٹکار دی۔ ''وہ بڑا آیا نصیحت کرنے والا۔ بچہ کوٹھے پر نہ اڑائے تو کیا اس کی میا کے سینے پر چڑھ کر اڑائے؟ ہاں تو بیٹا پھر اس نے پتنگ کس بات پر کاٹی؟''

''میں نے کہا' تم کون ہوتے ہو منع کرنے والے؟ خوب اڑائیں گے پتنگ۔ تمہارا اجارہ نہیں۔ بس اس پر اس نے لنگر ڈال کر میری پتنگ کاٹ لی۔'' صاحبزادے نے مزے میں آ کر دو چار موٹی موٹی گالیاں بک ڈالیں اور اس کے تو جیسے مرچیں ہی لگ گئیں۔ جی چاہا کہ آٹا چھوڑ کر لگائے دو تین' اور یہ اماں' منع بھی نہیں کرتیں اسے۔ بالشت بھر کا لونڈا اور یہ گالیاں۔ وہ اتنی بڑی ہو گئی تھی پھر بھی جب اس نے ایک بار صرف یونہی ایک گھریلو سی گالی غصے میں آ کر بک دی تھی تو اماں چکنی لے کر مارنے کھڑی ہو گئی تھی مگر......

''ہے ہے قربان کروں ایسے خدائی فوجدار کو۔ تو بیٹا جب وہ چھت پر نہ ہوا کرے تو اڑایا کر پتنگ۔ کمینوں کے منہ نہیں لگتے اور پھر تیرے ابا ہیں ظالم۔ کہیں سن پایا تو اپنی اس کی جان ایک کر دیں گے۔''

''کی نہ ہو ایک جان'' وہ پھر بدبدائی۔ بھلا یہ بھی کوئی بات تھی کہ جس کے لیے وہ اتنے دن سے سوکھ رہی تھی۔ اسے کوئی گالیاں دے؟

ہوا کیا نہ کرے؟ وہ تو شام سے ڈٹا رہتا ہے چھت پر۔ پلنگ ولنگ بھی وہیں ڈال رکھا ہے اور شاید سوتا بھی وہیں ہے۔ مرے خدا کرے جنازہ نکلے۔ وہ کوسنے دے کر اپنا دل ٹھنڈا کر رہا تھا۔ لیکن وہ آپ ہی آپ مسکرا رہی تھی۔ جیسے وہ یہ کوسنے سن ہی نہ رہی تھی۔

اور واقعی وہ تو اس وقت کچھ سوچ رہی تھی۔ ایک بڑے مزے کی بات!

''پنجرے کا پنچھی اڑان کے لیے پر تول رہا تھا۔''

رات کو ماں نے پلنگ پر لیٹتے ہی چابیوں کا گچھا کمربند سے کھول کر دیتے ہوئے کہا۔

''لو یہ...... اور کوٹھری کا تالا کھول کر زینے کے دروازے میں ڈال دو۔ آج تو بچے کی پتنگ پر نیت خراب کی۔ کل کو گھر کا صفایا کر دے گا۔ اے ہاں نگوڑا!! اور پھر اپنا گھڑا جیسا چمکتا ہوا پیٹ کھول کر اطمینان سے ٹانگیں پسار دیں۔ اپنے بھر حفاظت کر چکی تھیں۔ لیکن ادھر شروع ہو گیا کاٹ پیچ۔ وہ کوٹھری کا تالا کھولتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ ''چھت سے چھت تو ملی ہوتی ہے۔ آج اس سے وہ سب کچھ کیوں نہ کہہ ڈالوں جو ہوش سنبھالنے کے بعد سے اب تک دل میں بھرا ہوا ہے۔'' زینے کا دروازہ مقفل کر دیا گیا۔ لیکن گچھے سے اس کی چابی غائب ہو کر تکئے کے نیچے پہنچ گئی۔

چوکی کے گھنٹے نے ٹن ٹن دو بجائے۔ گھر میں سب بے خبر سو رہے تھے۔ وہ تکئے کے نیچے سے چابی نکال کر ننگے پاؤں اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہوا کا ایک بھیگا سا جھونکا آیا اور اسکی جوانی کو ہلکورہ دے گیا۔ کسی نے سوتے سوتے پاؤں پٹخا اور وہ دبے قدموں پانی کی گھڑونچی کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ وہ تھوڑی دیر تک تاروں کی روشنی میں سب کو گھورتی رہی کہ کہیں کوئی جاگ تو نہیں رہا ہے۔ پھر اطمینان کر کے اس نے چپکے چپکے تالا کھولا۔ اب دروازہ کھولنے کی مہم تھی۔ لیکن وہ بھی بغیر چیں چپڑ کئے اس طرح وا ہو گیا جیسے کوئی بھوکی بھکارن چند ٹکوں کی خاطر لوتھ پڑ جائے۔ کتنے زور سے اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ جیسے اب وہ پسلیوں کو توڑ کر رہے گا۔ زینے کے گھپ اندھیرے میں اس کی جلتی ہوئی آنکھوں کے سامنے وہ سب تارے ناچ رہے تھے۔ جو اس نے سر شام سے اس وقت تک گنے تھے اور اس کی کنپٹیاں شدت جذبات سے دھڑ دھڑ ہو رہی تھیں۔ اس پر بھرائے ہوئے مچھروں کی بھن بھن اور کچوکے۔ جانے کس مشکل سے آدھے زینے طے کئے۔ اس وقت تو واقعی اسے اپنا جسم پہاڑ معلوم ہو رہا تھا۔ شوق' خوف اور اندھیرا۔ سانس روکنے سے اس کا سر چکرانے لگا اور پھر آنکھوں کے سامنے رنگ برنگے دھبے پھیل گئے۔

گدا گد.... وہ جوان پچھتی' گیند کی طرح زینوں پر گرتی اچھلتی باپ کے پلنگ پائے سے جا ٹکرائی۔

ہو ہو... ہائے... چور... اللہ۔ چیخیں سن کر اس کی آنکھوں کے سامنے رنگ برنگے دھبے سکڑ گئے۔ لالٹین کی بتی اونچی کی گئی۔

''ہے ہے یہ'' ماں نے ایک دو ہتڑ اپنے متزلزل سینے پر رسید کیا۔ ''ارے میں تو پہلے ہی اس رنڈی کے گن دیکھ رہی تھی۔ ہائے تو مر کیوں نہ گئی۔'' غریب ماں کو تو جیسے غش آنے لگا۔

’’ذبح کردوں گا اسے‘بس کوئی روکے نہ مجھے۔ کہے دیتا ہوں۔اوپر سے ہو کر آئی ہے مردار‘‘ باپ کی حالت مارے غیرت کے غیر ہوگئی۔لیکن شاباش ہے کہ آپے سے باہر تو تھا لیکن کہہ رہا تھا سب چپکے چپکے۔ارے ہاں کوئی اور محلے والے سن لیں تو.... تو۔

بڑا بھائی شاید اپنی کسی نئی معشوقہ کا خواب دیکھتے دیکھتے چونکا تھا۔اس لیے اس کی جو حالت تھی بس بیان سے باہر۔دوسرے وہ کتنی ہی بار اشاروں ہی اشاروں میں اسے سمجھا بھی چکا تھا کہ ’’دیکھو یہ کنواں ہے‘اس میں کسی کی بہن کو نہیں گرنا چاہیے۔‘‘ اس پر بھی نہ مانی تو یہ لے۔بس چوٹی پکڑی اور دینا شروع کیے جھٹکے۔باپ کی غیرت اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہی تھی۔اب جو اتنا آسان طریقہ دیکھا تو خود بھی جٹ گیا۔لیکن ماں چونکہ بارہویں امید سے تھی۔اس لیے محنت سے گریز کر گئیں۔ویسے جتنی بھی خاص قسم کی گالیاں یاد تھیں ہر پھر کر دہرائی جا رہی تھیں۔لیکن وہ بے انتہا تکلیف محسوس کرتے ہوئے بھی چیخ نہ سکتی تھی۔ارادے کی ناکامی انسان کو بزدل بنا دیتی ہے اور بزدل ہی دنیا سے خوف کھاتا ہے۔اس میں اتنی ہمت ہی نہ تھی کہ ان مجرم منصفوں کے خلاف زبان ہلا سکے۔

کتنے ہی مہینے گزر گئے اس واقعے کو۔وہ سمجھتی تھی کہ جس طرح بڑے بھائی کی عیاشیاں ’’سیانا ہے‘یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے‘‘ کہہ کر بھلا دی جاتی ہیں۔اسی طرح اس کے عزم گناہ کو بھی فراموش کر دیا جائے گا۔لیکن پگلی! عورت کی حیثیت کو بھول گئی۔عورت ایک کٹھ پتلی ہے جس کی ڈور سماج کے کوڑھی ہاتھوں میں ہے اور ان کوڑھی ہاتھوں میں جب چل ہونے لگتی ہے تو ڈور کے جھٹکوں سے یہ کٹھ پتلی نچائی جاتی ہے لیکن اگر اس کٹھ پتلی میں جان پڑ جائے اور وہ اپنی مرضی کے مطابق حرکت کرنے لگے تو سماج کا لوتھ پڑا ہوا سڑا نڈھ جسم کس سے دلچسپی لے۔وہ سوچتی تھی کہ جس طرح اس کے گھر والے اس کی جوانی کے تقاضوں کی طرف سے کان بہرے کر کے بیٹھ رہے۔اسی طرح اس واقعے کو بھول کر اپنی غلطی کو تسلیم کر لیں گے۔لیکن یہ محض اس کا خیال تھا۔اس کے فرشتہ صفت سرپرستوں کی نظر میں اس کی زندگی پر گناہ کی جو خراش آ گئی تھی۔بھلا وہ کبھی مندمل بھی ہو سکتی تھی۔

’’بدمعاش‘‘ اس کا بدمعاش بھائی ذرا سی بات پر کہہ اٹھتا۔

’’اری‘‘ ماں اس کی اتری صورت ہی دیکھ کر ایک سانس میں گھنی گھنی گالیاں سنا ڈالتی۔

معمولی خراش لعن طعن کے زہریلے ناخنوں سے کریدی جا رہی تھی۔یہاں تک کہ وہ خراش ایک بڑا سا گھاؤ بنا دی گئی۔ایسا گھاؤ جو اندر ہی اندر سڑ کر زہریلا ہو جائے اور پھر اس کا زہر زندگی پر سکرات طاری کر دے۔لیکن خوفناک ناخن پھر بھی چین نہیں لیتے۔

’’یہاں کیوں پڑی ہے؟ نگوڑی کو بخار ویسے ہی رہتا ہے۔اس پر یہ لو اور دھوپ مگر میں جانتی ہوں کہ سب کا سنگ بیٹھ کر کاہے کو دل لگے گا۔بات چیت ہوگی اور بیوی بنو کا دھیان بھٹکے گا۔‘‘ ماں کھنساتی ہوئی لوٹا لے پاخانے میں جا گھسی۔

اس نے نڈھال ہو کر اپنی ٹانگیں سمیٹ لیں۔باورچی خانے کی چھت پر مسٹنڈے بندر اپنے حساب زخمی بندر کا علاج کر رہے تھے۔اس کے سینے میں درد پھر انگڑائیاں لینے لگا۔حلق سے سینے تک سرسراہٹ اور پھر وہی ہڈیوں کا پگھلا ہوا گودا اسے اندر ہی اندر تلنے لگا۔

’’اللہ!‘‘ اس نے للک کر پکارا اور پھر اپنی فریادی نظریں نیلے آسمان کی طرف اٹھائیں جو ایک وسیع ڈھکنے کی طرح دنیا پر رکھا ہوا تھا۔نظریں دیر تک ڈھکنے کے اس پار جانے کی کوشش کرتی رہیں۔جہاں اس کے خیال سے انصاف و رحم کی دنیا بسی تھی۔لیکن فریادی نظریں ناکام رہیں۔تھک کر اسے خیال آیا کہ اللہ میاں اپنی دنیا کو آسمان کے ڈھکنے سے ڈھک کر بالکل اس طرح مطمئن ہو گئے ہیں۔جس طرح وہ ایک دن کٹورے میں بچی کچھی دال رکھ ڈھک کر مطمئن ہو گئی تھی۔لیکن جب ایک گرم دوپہر گزرنے کے بعد اسے دال کا خیال آیا تو دیکھا دال سڑ کر بجبجا رہی تھی۔

◆◆◆

نیلم

سرد و منجمد رات کا ابتدائی حصہ' کمرے میں بالکل خاموشی طاری تھی۔ اور میں لحاف میں سمٹی سمٹائی ایک افسانے کے پلاٹ پر غور کر رہی تھی۔ ایسی برفیلی راتوں میں سوائے سوچنے کی اور کرتی بھی کیا۔ لکھنا پڑھنا تو کجا' ایسے میں لحاف سے منہ نکالنا بھی دشوار لگتا ہے۔ دفعتاً میری سب سے چھوٹی بہن چلائی اور پھر ساتھ ہی سب بھائی بہنوں کی ''دوڑو پکڑو' دروازے بند کرلو'' کا شور برپا ہو گیا۔ سب بچے بستروں سے اٹھ اٹھ کر ادھر ادھر دوڑنے لگے۔ اس یکا یک قیامت نے مجھے مجبور کیا کہ لحاف سرکا کر دیکھو کہ ہوا کیا ہے۔

''کیا کر رہے ہو تم سب؟'' میں نے ڈانٹ کر پوچھا۔

''کچھ نہیں'' میرا بھائی پلنگ کے نیچے لکڑی سے کھڑ بڑاتا ہوا بولا۔

''وہ ہے پلنگ کے نیچے۔ کونے میں'' چھوٹی بہن پھر چیخی اور وہ پلنگ کے نیچے گھس گیا اور چند لمحے بعد جب وہ نکلا تو اس کے ہاتھ میں بلی کی دم تھی۔

''یہ ہے'' وہ اس کی دم پکڑے جیسے اسے جھولا جھلا رہا تھا۔

''میاؤں'' بلی کی نیلی نیلی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ مجھے اس کی بے بسی پر رحم آ گیا۔

''اسے چھوڑ دو ورنہ تمہیں اچھی طرح ٹھوکوں گی۔''

''اچھا؟'' وہ آنکھیں مٹکا کر بولا اور بلی کو دھپ سے میرے پلنگ پر پٹخ دیا۔ اب وہ میری گود میں تھی' دودھ کی طرح اجلی' ریشم کی طرح ملائم اور موسم سرما کی دھوپ کی طرح گرم۔ میں پیار سے اس پر ہاتھ پھیرنے لگی اور وہ میرے لمس سے خوش ہو کر کو بڑ نکالے' خرخر کرنے لگی۔

''پھینک دو اسے' کیا گود میں لیے بیٹھی ہو!'' اماں بی کو شاید انسان و حیوان کا یہ رشتہ محبت کچھ اچھا نہ معلوم ہوا۔

''واہ! سب نے بیچاری کو بے گناہ اتنا مارا تو میں اس سہلاؤں بھی نہیں؟'' میں نے اس کے منے سے سر پر پیار کرتے ہوئے جواب دیا۔

''بلی بڑی منحوس ہوتی ہے' اس لیے اس کی یہی سزا ہے۔'' نانا میاں اپنے بستر پر کلبلاتے ہوئے بول اٹھے۔

''بلی بڑی منحوس ہوتی ہے!'' یہ جملہ میرے کانوں میں لوہے کی گرم گرم سلاخوں کی طرح اترتا ہوا معلوم ہوا۔ یہ جملہ میں نے آج سے قبل بھی سنا تھا۔ کب اور کیسے؟

اس دن آسمان پر شام سے سفید اور بھورے بادل ہوا کی لہروں پر سوار ادھر ادھر دوڑتے پھر رہے تھے جیسے کسی بڑے طوفان کی تیاریوں میں مشغول ہوں۔ ہم لوگ رات کا کھانا ذرا جلد ہی کھا کر اپنے اپنے بستر پر گھس چکے تھے۔ آتش دان کے سینے میں کوئلے دہک رہے تھے۔ اس کے باوجود کمرہ بالکل سرد تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قدرت نے اپنی دنیا کو برف میں لگا کر رکھ دیا ہے۔ باہر ہوا کے سرد جھونکے بند دروازوں سے لڑ رہے تھے اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کوئی ہر پھر کر ہولے ہولے کواڑ بھڑ بھڑا رہا ہے۔ لیکن کمرے میں بالکل سکوت تھا۔ بس اگر کوئی آواز تھی تو کوئلے کے چٹخنے کی۔ ابا میاں بھاری اوورکوٹ میں لپٹے' آرام کرسی پر لیٹے' آتش دان میں لپکتے جھجکتے سرخ سرخ شعلوں کو گھور رہے تھے اور میں اپنے لحاف سے منہ نکالے بہت غور سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ اب کی جاڑوں میں انہیں نہ جانے کیا وحشت تھی کہ سر شام ہی سب کو بھاری بھاری لحافوں میں دبک جانے کی ہدایت کیا کرتے۔ بس! پانی نہ پیو' زکام ہو جائے گا' بستر سے نہ اٹھو کھانسی آنے لگے گی' لحاف اچھی طرح اوڑھ لو ورنہ نمونیہ ہو جائے گا مگر ان تمام احتیاطوں کے باوجود انہیں زکام اور کھانسی ستائے ہوئے تھی۔

اماں بی کسی ضرورت سے اٹھیں اور کمرے کے باہر چلی گئیں اور مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ آج خلاف معمول ابا میاں نے گھبرا کر یہ کیوں نہ پوچھا کہ بستر سے کیوں اٹھیں۔ وہ اسی طرح گم سم سے بیٹھے انگاروں کی لپکتی' تھرتھراتی ننھی ننھی زبانوں کو گھورتے رہے۔ ادھر اماں بی باہر نکلیں اور ادھر ہوا کے ایک سرد جھونکے کے ساتھ ایک نئی روئی جیسی سفید ننھی منی بلی سردی سے پھولی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور اپنے گدگدے پنجے بڑھاتی میرے پلنگ کے پاس آ کر رک گئی۔

''میاؤں میاؤں'' جیسے وہ کہہ رہی تھی کہ مجھے بھی سردی لگ رہی ہے۔ اس کی نیلی نیلی آنکھیں کانچ کے دو ٹکڑوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ مجھے اس پر رحم آ گیا اور میں نے جھپٹ کر اسے اپنی گود میں اٹھا لیا۔ ابا میاں نے چونک کر میری طرف اس طرح دیکھا جیسے اب وہ سوال کریں گے کہ تم اتنی سردی میں بلی پکڑنے کیوں اٹھیں؟ میں چند لمحے کے لیے ان کی ناراضگی کے خوف سے دم بخود رہ گئی۔ مگر پھر بھی کچھ تو کہنا ہی تھا اپنی صفائی میں۔ میں نے اپنا نچلا ہونٹ ذرا لٹکا کر پلکیں پیٹتے ہوئے رونی آواز میں کہا۔

''آپ ہی تو کہتے ہیں کہ سردی سے نمونیہ ہو جاتا ہے اور پھر بس۔ اب اس بیچاری کو نمونیہ ہو جاتا تو!''

ان کے ہونٹوں پر میٹھی سی مسکراہٹ لہرا گئی اور انہوں نے نہایت نرمی سے ہدایت کی کہ میں اپنے بستر پر چلی جاؤں۔ اور میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب انہوں نے بلی کے لیے کوئی حکم نہ دیا۔ حالانکہ وہ بلیوں اور دوسرے پالتو جانوروں سے بہت چڑتے تھے۔ میں خوش خوش بلی کو اپنے بستر پر لے آئی۔ اور پھر رات گئے تک ہر طرف سے خالی الذہن ہو کر اس کے صاف ستھرے اور دھنکی ہوئی روئی کے مانند گدگدے جسم سے کھیلتی رہی اور وہ بھی میرے کھیل سے محظوظ ہو کر خرخرے کرتی رہی۔ اس رات وہ میرے پہلو میں سوئی میں نیند میں بھی اس کے ریشمی جسم کی ہلکی ہلکی گرمی برابر محسوس کرتی رہی۔

صبح میری آنکھ بہت ہی سویرے کھل گئی۔ کیونکہ بلی میرے پہلو سے غائب تھی۔ میں چپکے سے اپنے بستر سے اٹھی اور ادھر ادھر ڈھونڈھنے لگی۔ آخر وہ آتش دان کے قریب سوتی ہوئی ملی۔ میں اسے پکڑ کر بستر پر لے آئی۔

''بھئی اب بتاؤ تمہارا نام کیا رکھا جائے؟ میں نے اسے اپنی گود میں لٹا کر سوال کیا اور اس نے بڑے ٹھسے سے میاؤں کہہ کر آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے اس نے کہا ہو۔ ''بھئی جو جی چاہے رکھ لو میں تو بلی ہوں بلی ہی رہوں گی۔''

اخیر میں نے بڑے سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا کہ اماں بی کی انگوٹھی میں جو نیلا نگ جڑا ہے اسے وہ نیلم کہتی ہیں اور چونکہ اس بلی کی آنکھیں بھی شیشے کے نیلے ٹکڑوں کی طرح ہیں۔ اس لیے اس کا نام بھی نیلم ہی اچھا رہے گا۔

''دیکھو بھئی میں نے تمہارا نام نیلم رکھا ہے۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں آخر میں نے بھی اسے اپنا فیصلہ سنا دیا اور اس نے اپنے دانت اس طرح نکوس دیئے جیسے اسے میری بات پر ہنسی آ گئی۔ پھر اپنی چھدری مونچھوں کو مٹکا کر مجھے غور سے دیکھنے لگی۔ شاید وہ یہ سوچ رہی ہو گی کہ انسان بھی عجیب ہوتے ہیں کہ کچھ نہیں تو بیٹھے بٹھائے اچھی بھلی بلی کو نیلم بنا دیا۔ لیکن میں نے اس کے ان خیالات کی کچھ زیادہ پروا نہ کی اور اسے اپنے ساتھ رکھنے کے متعلق سوچنے لگی۔

ابا میاں نے تو کچھ اعتراض نہ کیا۔ اماں بی بڑی سیدھی سادی ہیں' انہیں ایسی باتوں سے کیا مطلب۔ اب رہے دادا میاں' سو وہ تو ضرور ناک بھوں چڑھائیں گے اور چھوٹا بھیا بھی ذرا گڑبڑ کرے گا۔ مگر خیر! میں اسے اپنے پاس اس طرح رکھوں گی کہ کسی کو شکایت کا موقع ہی نہ ہو۔ خود ناشتہ کرنے سے پہلے اسے ناشتہ کرا دیا کروں گی' کھانا کھانے سے پہلے اسے کھلا دیا کروں گی تاکہ میز پر اچک پھاند نہ کرے۔ رات کو اپنے ساتھ سلاؤں گی۔ دن بھر اپنی گود میں رکھوں گی۔ مگر بھئی دن بھر کیسے؟ اسکول بھی تو جانا ہوتا ہے۔ خیر کچھ بھی ہو میں اسے اپنے ساتھ ہی لے جاؤں گی۔ ان بی نیلم کی آنکھیں کھل جائیں گی' ہمارے سکول کے ٹھاٹ باٹھ دیکھ کر۔ اور پھر سب کی دیکھا دیکھی ذرا تمیز بھی آ جائے گی۔ لیکن استانی جی جو ناراض ہوں گی کہ بلی کو کیوں اسکول لے آئیں۔ تو ایسا کروں گی کہ اسے

اپنے ڈیسک میں چھپا دوں گی۔ استانی جی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہو گی۔ پھر چھٹی کے وقت اسے نکال کر سب لڑکیوں کو دکھاؤں گی۔ سب کا دل کیسے للچائے گا۔ کوئی کہے گا' ذرا ہمیں گود میں لے لینے دو اسے' کوئی کہے گا یہ کتنی اچھی ہے۔ اونہہ! مگر میں کسی کو ہاتھ تھوڑے لگانے دوں گی اپنی نیلم کو۔

تھوڑی دیر بعد میں اسے اٹھا کر اپنے پورے گھر کی سیر کرانے لے چلی۔

''دیکھو بی نیلم! یہ ہے ہمارے ابا میاں کے مطالعے کا کمرہ' ادھر آنے کی تکلیف نہ کرنا۔ کیونکہ تمہارا پیٹ کتابوں سے بھرنے سے رہا۔ یہ دیکھو' کھانے کا کمرہ ہے' تم یہاں آ سکتی ہو مگر ذرا تمیز سے۔ یہ نہیں کہ برتن ورتن توڑ ڈالو۔ یہ رہا باورچی خانہ یہاں جب تمہارا جی چاہے شوق سے آ جایا کرو مگر بھئی بہت ہوشیاری سے کیونکہ یہاں پر ہے موٹی رحیمن کا راج' اور وہ غصہ ور بھی ہے۔ اگر اس نے کبھی تم کو کسی ہنڈیا میں منہ ڈالے دیکھ لیا تو پھکنی سے تمہاری ٹانگ توڑ دے گی۔ بس پھر تم لنگڑ دین ٹکے کی تین ہو کر رہ جاؤ گی۔ سمجھیں کچھ؟ مگر ٹھہرو تو سہی۔ یہ تم میرے گود سے نکلنے کی کوشش کیوں کر رہی ہو؟ اے لو! کود گئیں دھم سے۔ اچھا اچھا میں سمجھی تمہیں بھوک لگی ہے۔ لو تو میں تمہیں چپکے سے چائے کا دودھ دیئے دیتی ہوں' پی لو۔ پھر تھوڑی دیر بعد چائے بنے گی تو خوب بہت سی تمہیں دوں گی۔ اچھا ارے نیلم! تم کتنی جلدی اتنا بہت سا دودھ سڑپ گئیں۔ خیر شرماؤ نہیں مجھ سے' آؤ اب تمہیں ملاقات کا کمرہ دکھلاؤں۔ یہاں تم ہر وقت بلا کھٹکے آ سکتی ہو۔ ابا میاں کے جتنے دوست آئیں' تم بھی ان سے دوستی کر لینا۔ وہ سب مجھے پیار کرتے ہیں۔ اس لیے تمہیں بھی ضرور پیار کریں گے۔ اچھا وہ دیکھو' وہ ہے سامنے دادا میاں کا کمرہ۔ کان کھول کر سن لو کہ بھول کر بھی ادھر کا رخ نہ کرنا۔ ورنہ حقے کے نیچے سے تمہاری کمر توڑ دی جائے گی۔ بڑے بکٹ خان صاحب ہیں وہ۔

نیلم نے میاؤں کر کے جیسے میری تمام ہدایتیں مان لیں۔

''کیوں ججو بیٹا! آج تمہارے ابا میاں اب تک نہیں اٹھے سو کر؟ رحیمن نے مجھ سے سرگوشی کے لہجے میں دریافت کیا۔

''ایں! ہمیں کیا معلوم؟ لگ رہی ہو گی انہیں سردی۔ کیوں نا نیلم!'' میں نے نیلم کے ریشمی رووں میں اپنا گال رگڑتے ہوئے کہا۔

''میاؤں'' گویا اس نے کہا۔ ''اور کیا؟''

''چلو بھئی نیلم اب سکول جانے کی تیاری ہو جائے۔'' جب میں اور نیلم ڈٹ کر ناشتہ کر چکے تو میں نے تجویز پیش کی۔

''تم یہاں سنگھار میز پر بیٹھی رہو ذرا میں فراک تبدیل کر لوں۔ جب تک تم شیشے میں اپنی صورت دیکھو۔ ارے تم نے کریم کی

شیشی زمین پر پھینک دی' بڑی خیریت ہوئی کہ ٹوٹی نہیں۔ بھئی ہمیں ایسی شرارتیں اچھی نہیں معلوم ہوتیں۔ ہٹو اب کنگھی کرنے دو ہمیں۔ اچھا دیکھو نیلم ہم نے اپنے بالوں میں ربن کتنی اچھی طرح باندھا ہے۔ خوبصورت لگتا ہے نا؟"

میں سکول جانے کے لیے بالکل تیار تھی۔ اب نیلم کو کیسے لے جایا جائے سکول؟ سوچ میں پڑ گئی۔ آخر ایک ترکیب سمجھ میں آ ہی گئی۔

"آؤ اب تم میرے اوور کوٹ کی جیب میں بیٹھ جاؤ نیلم" میں نے اسے جیب میں ٹھونس لیا۔

"تم اپنے دل میں برا نہ ماننا کہ ہمیں جیب میں رکھ لیا۔ بات یہ ہے کہ اگر تمہیں استانی جی نے دیکھ لیا تو ناراض ہوں گی' بس ذرا دیر کی قید ہے' ان کی نظر ذرا چوکی اور میں نے جھٹ تمہیں ڈیسک میں بٹھایا۔

سکول پہنچ کر جیسے ہی کلاس میں قدم رکھا۔ بدقسمتی سے عین استانی جی کے سامنے جیب کا راز ڈیسک میں بند ہونے سے پہلے ہی نکل بھاگا۔ استانی جی کی سخت گھرکیاں اور میرے گرم گرم آنسو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مع بی نیلم کے مجھے میرے گھر پہنچوا دیا گیا۔ اب راستے بھر میں اس خوف سے جان نکلتی رہی کہ ابا میاں خوب ناراض ہوں گے۔ ممکن ہے کہ اسی وقت حکم دے دیں کہ نیلم کو گھر سے نکال دو۔ لیکن جب گھر پہنچی تو مجھ سے کوئی باز پرس نہ ہوئی۔ کیونکہ ابا میاں پلنگ پر لیٹے بچوں کی طرح کراہ رہے تھے اور بڑی بڑی مونچھوں والے ڈاکٹر صاحب اپنے آلے سے ان کا سینہ دیکھ رہے تھے۔ اماں بی پردے کے پیچھے سے گھبرا گھبرا کر جھانک رہی تھیں۔

اس دن میں نے رحیمن کی پیٹھ پر سواری گانٹھتے ہوئے پوچھا۔

"اری ابا میاں کو کیا ہو گیا؟"

"سردی ہو گئی ہے انہیں' بیٹا!"

اس نے ایسے کہا جیسے سردی بڑی بری چیز ہے۔ مگر مجھے ذرا بھی فکر نہ ہوئی کیونکہ ابا میاں اتنے موٹے موٹے لحاف اوڑھے تھے کہ سردی کو بھاگتے ہی بن پڑتی۔ اس دن سے گھر کے سب لوگ تو ابا میاں کے پلنگ سے لگے رہتے اور میں سارا دن مزے سے اپنی نیلم سے کھیلتی رہی۔ اس دوران میں سوائے اس کے کوئی قابل ذکر واقعہ نہ ہوا کہ اماں بی اکثر چھپ چھپ کر رویا کرتیں' ابا میاں رات دن پلنگ پر لیٹے رہتے اور بہت سے لوگ آ آ کر جب دیکھو' جب ان سے یہی پوچھا کرتے کہ طبیعت کیسی ہے؟ نیلم نے کئی بار پتیلی میں منہ ڈالا۔ رحیمن نے پھنکنی ماری اور میں نے رحیمن کو خوب ہی نوچا۔ ہماری نیلم کی ٹانگ میں ذرا سا لنگ ہو گیا۔ میں نے چپراسی کے ہاتھ اسے ڈاکٹر کو دکھانے بھیج دیا۔ لیکن نیلم تھی ایسی احسان فراموش کہ میرے ذرا سے دبوچتے ہی پر اس نے اپنے پنجوں سے کتنے

ہی کھرونچے لگا دیے اور ایک دن ابا میاں نے مجھے اپنے پاس بلا کر پیار کیا اور میرے کہنے سے نیلم کو بھی۔

ایک دن صبح ہی صبح جب میں اور میری نیلم بستر سے اٹھے بھی نہ تھے کہ اماں بی اور دادا میاں کے زور زور سے رونے پر گھر کے سب لوگ رونے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے بھی رونا آ گیا۔ میں دوڑی دوڑی اس کمرے میں گئی جہاں ابا میاں لیٹے رہتے تھے۔ اماں بی ابا میاں کے پلنگ کے پاس زمین پر پاؤں پسارے بیٹھی چلا رہی تھیں اور ابا میاں اپنے پلنگ پر بالکل خاموش لیٹے تھوڑی سی آنکھیں کھولے انہیں دیکھ رہے تھے۔ ان کے سر سے لے کر ٹھوڑی تک پٹی بندھی ہوئی تھی اور ان کے دانت اس طرح نکلے ہوئے تھے جیسے انہیں اماں بی کی چیخیں سن کر ہنسی آ رہی ہو۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اماں بی زمین پر لیٹ کر اپنا سر زور زور سے پٹکنے لگیں اور دادا میاں اپنے سینے پر ہاتھ مار مار کر اپنے ہونٹ اس طرح چبانے لگے کہ ان کی سفید داڑھی کے بال ایسا معلوم ہوتا تھا کہ منہ کے اندر چلے جائیں گے۔ میں یہ منظر دیکھ کر ڈری اور وہاں سے بھاگ کر ایک دوسرے کمرے میں گھس گئی۔ میرے پیچھے میری نیلم بھی آ گئی۔ لیکن اس وقت مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہ ہوئی۔ میرے کانوں میں تو رونے چلانے کی آوازیں بے شمار سوئیوں کی طرح چبھ رہی تھیں۔ میں بڑی دیر تک کمرے کے ایک کونے میں زمین پر اماں کی طرح پاؤں پسارے بیٹھی رہی اور نیلم بھی کچھ بولائی ادھر ادھر پھرا کی۔

"میاؤں میاؤں! ہائے ہائے! آہ! اف" میں ان لرزا دینے والی صداؤں میں بالکل غیر شعوری طور پر گھر گئی۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ یہ میری سمجھ سے بالا تھا لیکن میں بار بار یہ محسوس کر رہی تھی کہ گھر کے موجودہ حالات سے میرا کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔

ابا میاں کی ہنسی' اماں بی کی چیخیں اور زمین پر لیٹنا' دادا میاں کا سینہ کوٹنا اور منہ میں گھستے ہوئے داڑھی کے بال..... یہ سب کچھ یونہی تو نہ تھا۔

بڑی دیر بعد موٹی تھل تھل رحیمن جھومتی جھامتی منہ بسورے کمرے میں داخل ہوئی اور مجھے زمین پر بیٹھے دیکھ کر اس طرح منہ کھولے اور آنکھیں پھاڑے بڑھی کہ میں سمجھی' یہ کم بخت ضرور ایسے برے وقت میں میری تمام شرارتوں کا بدلہ لے گی مگر اس نے مجھے گود میں اٹھا لیا اور اپنے بدبودار چکنے سینے میں بھینچ لیا۔ میرے نتھنوں میں قسم قسم کے سانسوں اور پسینے کی ملی جلی بدبو چڑھ گئی۔

لیکن نہ جانے کیوں میں اس سے الگ ہونے کی بجائے اور زیادہ چمٹ گئی۔ وہ مجھے دبا دبا کر بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔

"ہائے بچی' رو! تم آج یتیم ہو گئیں۔ تمہارے ابا مر گئے۔"

اتنا کہہ کر وہ پھسر پھسر رونے لگی اور ساتھ ہی میں بھی بلک اٹھی۔ نہ جانے کتنا روئی اور کب تک روئی۔ اور پھر اسی حالت میں سو

بھی گئی۔ جب آنکھ کھلی تو گھر میں سناٹا تھا۔ میں ڈری کہ سب مجھے چھوڑ کر کہیں چلے گئے شاید۔ میں نے ڈرتے ڈرتے باہر جھانکا۔ آنگن میں بہت سی عورتیں جمع تھیں اور ان کے درمیان اماں بی گھٹنے پر ٹھوڑی رکھے' بڑی بڑی آنکھیں میچے آنسو بہا رہی تھیں۔ اس وقت ان کے ہاتھوں میں چوڑیاں بھی نہ تھیں۔ حالانکہ صبح تک کلائیوں میں کھنک رہی تھیں۔ اور آج تو انہوں نے اپنے بالوں میں کنگھی کر کے چوٹی بھی نہ گوندھی تھی بلکہ لمبے لمبے بالوں میں خاک دھول اٹی ہوئی تھی۔ میں دوبارہ سہم کر کونے میں دبک رہی۔ اب مجھے نیلم کا خیال آیا۔ وہ نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ میں سوچنے لگی کہ اگر وہ ہوتی تو اس سے پوچھتی کہ تجھے معلوم ہے نیلم' یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کمرے سے باہر نکلتے ڈر معلوم ہو رہا تھا۔ اس لیے وہیں بیٹھی اسکا انتظار کرتی رہی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ دم ہلاتی میاؤں میاؤں کرتی آئی اور میں نے اسے پکڑ کر اپنی گود میں بٹھا لیا۔

''نیلم! رحیمن کہتی تھی کہ ابا میاں مر گئے۔'' میں نے کہا۔

نیلم نے اپنی نیلی نیلی آنکھوں سے مجھے تاکا اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ان نیلی کانچ کی دیواروں کے پیچھے بہت سے آنسو ٹپک جانے کے لیے سر ٹکرا رہے ہیں۔ ''میاؤں میاؤں'' میں سمجھی کہ وہ کہہ رہی ہے۔ ''ہائے!''

پھر وہ اپنی لمبی دم اس طرح زمین پر پٹکنے لگی جس طرح اماں بی اپنا سر پٹک رہی تھیں۔

اس روز شام کو دسترخوان پر سوائے ماش کی کھچڑی کے کچھ بھی نہ تھا۔ جو نہ تو مجھ سے کھائی گئی اور نہ میری نیلم سے۔ اس کے بعد اماں بی تھوڑی تھوڑی دیر بعد روتی رہیں۔ دادا میاں رہ رہ کر اپنا سینہ کوٹتے رہے۔ آئے گئے بھی ہائے وائے کرتے رہے اور رات بھر بادل بھی چیخ چیخ کر روتے رہے۔

صبح میری آنکھ اس وقت کھلی جب دادا میاں زور زور سے کہہ رہے تھے۔ ''بہو! تم نہ مانو لیکن بلی بڑی منحوس ہوتی ہے۔''

میں نے گھبرا کر اپنے پہلو میں نیلم کو ٹٹولنا چاہا لیکن وہ غائب تھی۔ میں نے لحاف سے منہ نکال کر دیکھا تو اس کی پیاری سی گردن دادا میاں کے سوکھے ہوئے پنجوں میں تھی۔ میں دیوانوں کی طرح دوڑی اور اس کی گردن کو ان کی گرفت سے آزاد کرانا چاہا۔ لیکن' لیکن! میرے گال پر ایک طمانچہ پڑا اور میری امنڈتی ہوئی آنکھوں کے سامنے ہر چیز دھندلی پڑ گئی۔

''ابا میاں! اے ابا میاں! بلی کو مارنا بھی تو بڑا منحوس ہوتا ہے۔'' اماں بی کی صورت میری آنکھوں کے سامنے چھائی ہوئی دھند میں اچانک ابھر آئی۔ ان کی آنکھیں سرخ تھیں اور پپوٹے بھاری ہو کر آنکھوں پر جھلک آئے تھے۔

''بہو! میں اس منحوس کو اپنے گھر میں نہیں دیکھ سکتا۔'' دادا میاں ہونٹ چبا چبا کر کہنے لگے۔ ان کی دھنسی ہوئی آنکھیں جیسے حلقوں

سے ابلی پڑ رہی تھیں۔

''مگر دادا میاں! یہ تو ابا میاں کے سامنے گھر آئی تھی اور انہوں نے اسے کچھ بھی نہ کہا تھا۔'' میں نے اپنی نیلم کو ان سے لینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''وہ کچھ کہتے کیسے؟ اس منحوس نے تو ان کی زبان ہی بند کر دی تھی۔''

دادا کی آنکھوں میں ایک دم آنسو آ گئے۔ لیکن نیلم کی گردن ابھی تک ان کی گرفت میں تھی اور وہ انتہائی بے بسی سے لٹکی ہوئی ٹکر ٹکر مجھے تک رہی تھی۔ دادا میاں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''بچی! بلی بڑی منحوس ہوتی ہے۔ دیکھو جس دن یہ گھر میں آئی' موت کو ساتھ لائی تمہارا باپ جھٹ پٹ ہو گیا' ہرا باغ اجڑ گیا۔ میرے بڑھاپے کی لاٹھی چھن گئی اور......''

ان کی آنکھیں جیسے حلقوں سے ابل پڑیں۔ چہرہ لال انگارہ' داڑھی کے بال کھڑے ہو گئے اور پھر وہ جھپٹ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اماں بی ہانپتی اٹھیں اور ان کے کمرے کے بند کواڑوں کے پاس جا کر کہنے لگیں۔

''ابا میاں! میں ہاتھ جوڑتی ہوں' اس کی جان نہ لیجئے گا۔'' اتنا کہہ کر ان کی آواز بھرا گئی اور وہ اپنے ننگے ہاتھ بھیگے زرد گالوں سے لگا کر رونے لگی۔

میں خوف سے لرزتی ہوئی دوبارہ اپنے بستر پر آئی جس پر میری نیلم کے کئی ایک سفید روئیں کانپ رہے تھے۔ میں لحاف میں گھس گئی اور سسک کر سوچتی رہی کہ دادا میاں کہتے ہیں۔ نیلم اپنے ساتھ موت لائی۔ مگر وہ تو بالکل اکیلی تھی۔ سبھی نے یہی دیکھا تھا۔ دادا میاں اتنے بڈھے ہو کر جھوٹ بولتے ہیں! اور پھر یہ بات تو کسی طرح سمجھ میں آتی ہی نہ تھی کہ ابا میاں کے چلے جانے سے نیلم کا کیا تعلق؟

''تم نے اب تک نہیں چھینکی یہ منحوس!'' نانا میاں نے زور سے کہا اور جیسے یادرفتہ کا فلم اچانک چل اٹھا۔

میں نے اپنی گود کی نرم و گرم بلی کو غور سے دیکھا۔ اس کی نیلی نیلی آنکھیں ایسی معلوم ہو رہی تھیں جیسے کانچ کے ننھے ننھے آسمانی پیالوں میں لرزتا ہوا شفاف پانی۔ میری طبیعت بہت زیادہ اداس ہو رہی تھی۔

''اماں بی! ایک تو بتایئے!''

''کیا بات؟'' وہ حیرت سے بولیں۔

''نیلم' میرے بچپن کی چہیتی بلی کا کیا انجام ہوا تھا؟''

''اسے تمہارے دادا میاں اپنے ہاتھ سے بوری میں بند کر کے تالاب میں پھینک آئے تھے۔ وہ ڈرتے تھے کہ کہیں پھر وہ گھر واپس نہ آ جائے۔'' ان کی آواز میرے کانوں میں اس طرح آ رہی تھی جیسے آندھی کے جھکڑوں میں کوئی دور سے متواتر پکار رہا ہو۔

''دھپ!'' روئی جیسی بلی تو ہم پرست انسانوں کی شقی القلبی پر تڑپی اور کود کر کھڑکی سے نکل بھاگی۔

''نیلم! نیلم!'' میرے دماغ پر وہ نئی روئی کا چھایا ہوا ملائم تو وہ آہستہ آہستہ بھاری ہونے لگا۔

◆◆◆

ننھے میاں

مردانے کمرے میں ننھے میاں اور ان کے دوست بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ باتیں بھی ایسی جو بار بار کانا پھوسیوں میں تبدیل ہو جاتیں۔ لیکن نہ جانے کیوں ننھے میاں کی خوبصورت آنکھیں بوجھل ہوئی جا رہی تھیں۔ اور پورا چہرہ لال بھبھوکا' وہ رہ رہ کر پہلو بدل رہے تھے۔ ان کا دوست جو عمر میں ان سے بھی کم دکھائی دیتا تھا۔ اپنی پتلیاں گھما گھما کر کھسر پھسر تیز کرتا جا رہا تھا۔ ''اماں بس کرو'' ننھے میاں بری طرح کسمسا کر بولے۔

''سنو تو یار! پھر ایک دن وہ آ گئی جھانسے میں۔'' وہ پھر سرگوشیاں کرنے لگا۔

ننھے میاں کا چہرہ ایک بڑا سا دہکتا ہوا انگارہ معلوم ہونے لگا۔ وہ ایک عجیب سی ہنسی ہنسنے لگے۔

''بڑے بدمعاش ہو تم۔'' انہوں نے لجا کر کہا۔

''اور نہیں تو کیا تمہاری طرح شریف۔'' دوست نے تڑ سے جواب دیا اور ننھے میاں کو جیسے اس نے کوئی گھناؤنی گالی دے دی۔ بس تمتمایا ہوا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ دوست نے ان کی دل شکنی کے بعد دوبارہ کسی سفید داڑھی والے بڑے میاں کی طرح ناصحانہ لہجہ اختیار کیا۔

''میری مانو اس شرافت میں کچھ نہیں دھرا ہے۔ ایک دن چلو تو میرے ساتھ دنیا میں جنت دکھا دوں۔ کیا خیال ہے چلو گے؟''

ننھے میاں نے جواب میں شرما کر گردن جھکا لی۔

''تو پھر چلو گے آج؟ بڑی تفریح رہے گی۔''

''آج نہیں' پھر کسی دن دیکھا جائے گا۔''

وہ ہمیشہ تفریح کے موقعوں پر کترا جایا کرتے تھے۔

تھوڑی دیر کی مزید گپ شپ کے بعد دوست تو چلتا بنا۔ لیکن ننھے میاں جیسے بیٹھے تھے۔ ویسے ہی بیٹھے رہے۔ ان کی خوبصورت آنکھیں سڑک کے اس پار اونچی اونچی عمارتوں کو پھلانگتی کہیں خلا میں کچھ گھور رہی تھیں اور ان کے چہرے پر نوجوانی کے خون کی

سرخیاں رینگ رہی تھیں۔ انہیں بار بار ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے بازوؤں میں مچھلیاں تڑپ رہی تھیں۔

ان کا نام تو کچھ اور تھا۔ لیکن انہیں سب ننھے میاں کہتے تھے۔ کھاتے پیتے گھرانے کے لاڈلے پوت' اور محلے کے شریف و سنجیدہ لڑکوں میں گنے جاتے تھے۔ اس لیے محلے بھر کا منہ ننھے میاں' ننھے میاں کہتے سوکھتا تھا اور واقعی ننھے میاں تھے بھی اسم بامسمی' انیس بیس کا سن' کالج میں پڑھتے تھے اور غضب یہ کہ وہاں کتنی ہی لڑکیوں کا ہر وقت ساتھ' لیکن کیا مجال جو کسی کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے پکڑے جائیں۔ بس جیسے اس دنیا میں رہتے ہی نہ تھے۔ اس کے برعکس ان کے تمام دوست اول درجے کے تیز و طرار' توبہ کیجئے' جو ایک پل کے لیے نچلے بیٹھیں۔ کم بختوں کی رگ رگ پھڑکتی رہتی۔ خصوصاً ساتھ پڑھنے والی کو چھیڑنے میں تو کسی وقت نہ چوکتے۔ پروفیسر صاحب تو سمجھتے کہ بیچارے طلباء کس انہماک سے لیکچر سن رہے ہیں لیکن انہیں اس کا پتہ ہی نہ ہوتا کہ ان میں سے نہ جانے کتنے اپنے پیچھے بیٹھی ہوئی لڑکیوں کی پنڈلیوں پر اپنی ایڑیوں سے ٹھونگیں لگا رہے ہیں۔ غرض ایسے منچلے لوگوں کے حلقے میں ننھے میاں' بدھو میاں کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ یہ تو تھیں خیر اوپری باتیں۔ لیکن اصلیت یہ تھی کہ ننھے میاں ضرورت سے زیادہ شرمیلے واقع ہوئے تھے۔ ویسے تو اکثر ان کا بھی جی چاہنے لگتا کہ وہ بھی لڑکیوں کو چھیڑیں اور پھر ان کی جلتی ہوئی نظروں سے اپنی رگ رگ میں حرارت سمیٹ لیں۔ لیکن ان کی ہمت نہ پڑتی۔ جہاں کسی لڑکی کو دیکھا اور حواس باختہ ہوئے۔ پھر باوجود کوشش کے نظر اٹھائے نہ اٹھتی۔ گویا ایسے موقعوں پر ان کی آنکھوں پر پتھر کے دو بڑے بڑے ٹکڑے رکھ دیئے جاتے اور ان کے دماغ کے گوشے گوشے میں ان کا ایک چشم دید واقعہ بچھو کے ڈنک کی طرح گڑنے لگتا۔ بات یہ تھی کہ ایک دفعہ جمالی کے بار بار آوازے کسنے پر ایک لڑکی نے مشتعل ہو کر بھرے بازار میں اچھی طرح اس کے سوٹ کی دھول جھاڑ دی تھی۔ بس ایسی ہی چند باتیں تھیں جو ان کی راہ میں حائل تھیں اور وہ خواہ مخواہ شریف مشہور ہو گئے تھے۔

ادھر کچھ دنوں سے تو انہیں اپنا شریف ہونا زہر معلوم ہو رہا تھا۔ خصوصاً اس وقت جب ان کے بے تکلف دوست اپنے عشق کی داستانیں بڑھا چڑھا کر بیان کرتے کہ کس طرح ایک صاحبزادی سے پینگیں بڑھیں اور آخر کار وہ ان کے ساتھ چل دینے پر آمادہ ہو گئیں۔ لیکن ننھے میاں کے دوست بھی کوئی عمر بھر کا پٹہ لکھا کر دوستی کرتے تھے؟ بس یہیں آ کر اکثر عشق کی پھڑکتی ہوئی داستانیں دم توڑ دیتیں۔ ننھے میاں یہ سب سن سن کر بہت مضطرب ہو جاتے اور اکثر اپنے اردگرد پھیلی ہوئی کتابوں میں سے کوئی کتاب اٹھا کر دیکھنے لگا تا کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے ان داستانوں کی رنگین لڑکیوں کو محو کر سکیں جو ہر وقت ان کے دماغ میں گھسی رہا کرتی تھیں۔ لیکن کتاب کے صفحات پر بھی وہی شوخ اور چنچل لڑکیاں انگڑائیاں لیتی نظر آتیں۔ جن کے گرد ان کے دوست کال کے مارے کتوں کی

طرح منڈلایا کرتے۔ وہ لڑکیاں جن کا تصور ہی ننھے میاں کے دل میں گدگدی کرنے لگتا تھا لیکن ان کے دوست کہاں ایسے سیدھے؟ وہ ان کے اضطراب سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اپنی کہے جاتے اور ننھے میاں بیچارے قابل رحم حالت میں بیٹھے سب سنا کرتے اور بھئی سچی بات تو یہ تھی کہ جب کبھی اتفاق سے ان کے دوست ایسی باتیں نہ کرتے تو وہ دل ہی دل میں دعا کرنے لگتے کہ خدا کرے کسی طرح وہی موضوع چھڑ جائے اور جب وہی باتیں شروع ہو جاتیں تو وہ اس طرح سرخ ہو جاتے جیسے کوئی ان کے چٹکیاں لے رہا ہو۔ ان پر تو وہی بس بھونڈی سی مثل چپکتی تھی کہ کانا مجھے بھائے نہ کانے بن سہائے نہ۔

ایک دن جب وہ اپنے ایک سکھے لیکن پکے عاشق قسم کے دوست سے سرگرم گفتگو تھے تو کمرے کے سامنے سے ایک عورت میلی سی دھوتی میں لپٹی' چاندی کی موٹی موٹی جھانجوں میں پھنسے ہوئے پاؤں ٹپکتی نکلی۔ اس کے کولہے پر ایک میلی کچیلی' دکھتی آنکھوں والی بچی سواری کیے ہوئے تھی۔ ننھے میاں کے دوست نے اپنی چندھی آنکھیں جن میں بلا کی تیزی تھی' تعاقب میں ڈال دیں۔ عورت ننھے میاں کے گھر کی ڈیوڑھی میں داخل ہو گئی۔

''یہ کون ہے؟'' دوست کے موٹے موٹے ہونٹ پھڑکے۔

''للو حلوائی کی عورت ہے؟'' ننھے میاں نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''یار کیا یہ تمہارے ہاں آتی رہتی ہے؟''

''ہاں'' ننھے میاں کو کوفت ہو رہی تھی کہ اس میلی کچیلی عورت کے لیے اتنی کھوج کس لیے؟

''جاؤ جی' تم بڑے بدمذاق ہو۔'' ننھے میاں نے اپنی سمجھ میں دوست کے چٹکی لی۔

وہ ہنسا اور اس کی کنپٹیوں پر جھریوں کا جال بچھ گیا۔ وہ فلسفیانہ انداز میں بولنے لگا۔

''دوست! حسن کہیں بھی ہو' وہ قابل التفات ہے۔ اور تم جانتے ہو کہ حسن کیا ہے؟''

اس کی بھوکی آنکھیں ساکت ہو کر ننھے میاں کے چہرے کا جائزہ لینے لگیں۔ ننھے میاں کے ملائم چہرے پر بیزاری اپنے قدم جما رہی تھی۔ انہیں اس حلوائن کے متعلق جو بڑھاپے کی حدود میں قدم بڑھا رہی تھی اور جسے محلے میں تقریباً سبھی چاچی کہا کرتے تھے۔ ایسا سوال زہر معلوم ہوا۔ جل کر بولے۔ ''تمہیں جانو' میں تو بدھو ہوں۔''

''حسن نام ہے عورت کا اور بس!'' وہ دانت نکال کر زور سے ہنسنے لگا۔

''بس اب سوچو بیٹھو کہ میرے اس نکتے کو' میں تو چلا۔''

اور واقعی جب وہ چلا گیا تو ننھے میاں گم سم تھے۔ ان کے دماغ کے پردوں پر چاچی جھانجھ کے جھنا جھن کے ساتھ تھرک رہی تھی۔

آج سے قبل انہوں نے سینکڑوں دفعہ چاچی کو دیکھا تھا اور اس سے باتیں کی تھیں۔ چاچی کو جب بھی اپنے میکے خط لکھوانا ہوتا تو ننھے میاں کی خوشامد کرتی۔ ویسے تو محلے میں اوروں سے بھی یہ کام نکل سکتا تھا۔ لیکن مجبوری یہ تھی کہ اسے خط کا مضمون اچھی طرح بولنا نہ آتا تھا جس سے دوسرے لکھنے والے جھنجھلاتے۔ لیکن ننھے میاں چونکہ بڑے سیدھے سادے اور بقول چاچی سب سے زیادہ ''کابل'' تھے۔ اس لیے وہ ہمیشہ ننھے میاں سے خط لکھوایا کرتی تھی۔ وہ کبھی تو اس ضرورت سے ننھے میاں کے گھر آ جاتی اور کبھی ان کو اپنے ہاں بلا لیتی۔

ننھے میاں قلم دوات سنبھال کر چارپائی کے ایک کونے میں بیٹھ جاتے اور دوسرے کونے میں چاچی مع اپنی گود کی بچی کے براجتیں۔ کافی فاصلہ ہونے کے باوجود ننھے میاں ناک سکیڑ سکیڑ کر چاچی کے کپڑوں سے آنے والی مخصوص قسم کی بساند برابر محسوس کرتے رہتے۔ چاچی اکثر بڑی بے تکلفی سے اسی جگہ بیٹھے بیٹھے اپنی ننھی لونڈیا کو دودھ بھی پلانے لگتی اور ننھے میاں جیسے کٹ کر رہ جاتے۔

چاچی کی طبیعت بھی کچھ عجیب سی تھی۔ بیچاری کی ازدواجی زندگی پچیس کڑے مرحلے طے کر چکی تھی۔ لیکن عام ہندوستانی گھرانوں کی طرح میاں بیوی کے تعلقات جیسے جیسے پرانے ہوتے گئے۔ ویسے ویسے وبال جان۔ لوگ کہتے ہیں کہ اگر دو پالتو جانور کچھ دن ایک کھونٹے پر بندھیں تو آپس میں محبت کرنے لگتے ہیں۔ لیکن اللہ ہی جانے یہ کیا بات ہے کہ دو انسان میاں بیوی ہو کر جنگلی جانور کیسے ہو جاتے ہیں۔ اس طرح للو کی چاچی کے ساتھ ہر روز ٹھنی رہتی۔ دوسرے تیسرے بک بک جھک جھک کے بعد جوتا لات کی نوبت آتی رہتی۔ اس کے باوجود چاچی کے پان کی پیک سے سرخ ہونٹ زیادہ تر مسکراتے رہتے۔ بس اس وجہ سے محلے والے اسے جانے کیا کیا کہا کرتے تھے مگر ننھے میاں کو ان باتوں سے کیا مطلب۔ وہ تو چاچی کو چاچی سے زیادہ کچھ سمجھتے ہی نہ تھے۔

''ہاں تو میاں لکھو۔'' چاچی مسکراتی ہوئی کہتی۔

''کیا لکھواؤ گی۔ ایک بار بول دو۔ میں سب لکھ دوں گا۔

''بس لکھ دو میاں کہ آج کل بڑی تنکلیپھ سے گجر بسر ہو رہی ہے۔ تس پر روج روج کی ہائے ہائے۔ اب تو دکھ بھوگنے کی تاکت نہیں۔ پر تمہی لوگن کی لاج لیے بیٹھی ہوں۔ تس پر تم سب بھی ہمری کوئی اچھی بری کے پوچھیا نہیں اور میاں تمری جو جو کبھی ماں آوے

لکھ دو۔ سنتی، بسنتی، چندا منی، رامی، بابو، چنی، منو اور ہمری اس بیٹا کا نمسکار بھی لکھ دو۔ ننھے میاں کی اماں بچوں کی اس لمبی چوڑی فہرست سے چڑ کر کہتیں۔ ''اور جو پیٹ میں ہے اس کا نمسکار بھی لکھوا دو بھوجی۔'' کچھ معاملہ یہ رہتا کہ شاید ہی کبھی چاچی کی گود خالی رہتی ہو اور شاید ہی کبھی پیٹ۔ چاچی پیٹ والے بچے کا نام سن کر بڑے غرور سے ہنستی اور اس کے چہرے پر رنگ بکھر جاتا۔ جیسے یہ کیڑے مکوڑے ہی اس کی زندگی کا حاصل تھے تو خط ہمیشہ کچھ اس مضمون کا ہوا کرتا جو ننھے میاں ذرا کی ذرا میں لکھ کر چاچی کی سینکڑوں دعائیں لوٹتے۔ دعائیں بھی وہی جنہیں وہ اپنے تجربے کے بعد جنجال کہا کرتی تھی۔

ننھے میاں کی آنکھیں سوچتے سوچتے نیم وا ہو گئیں اور سر چکرانے لگا۔ اتنا سوچ چکنے کے بعد انہوں نے دل ہی دل میں اپنے سکھلے دوست کے الفاظ دہرائے۔ ''حسن کہیں بھی ہو وہ قابل التفات ہے اور حسن کیا ہے؟ حسن نام ہے عورت کا۔''

جھانجھ کی چھن چھن ننھے میاں کے کانوں میں تیزی سے آ رہی تھی انہوں نے مڑ کر ڈیوڑھی میں کھلنے والے دروازے کی طرف دیکھا۔ چاچی اپنی لونڈیا کو کولہے پر جمائے کھڑی مسکرا رہی تھی۔

''کیا سوچ رہے ہو ننھے میاں؟'' وہ ہولے ہولے ننھے میاں کے پاس آ گئی اور کمرے میں کھٹی کھٹی بساند پھیل گئی۔ نہ جانے کیوں آج انہیں یہ بو بڑی پیاری معلوم ہوئی، کالج کی لڑکیوں کے کپڑوں سے آنے والی مدہوش کن خوشبوؤں سے کہیں بڑھ کر۔ انہوں نے ہمت کر کے اپنی آنکھوں میں ایک رومانی چمک پیدا کرتے ہوئے تاکا۔

''کچھ نہیں چا....'' وہ چاچی کہتے کہتے چپ ہو گئے۔ بھلا یہ بھی کوئی رشتہ تھا۔ چاچی

''کھت لکھوانا تھا بھیا''

''اس وقت نہیں، شام کو آ کر لکھوں گا تمہارے گھر''

''اچھا'' وہ اپنی اونگی دھوتی اور اونچی کر کے سڑک پر اتر گئی اور ننھے میاں عمر میں پہلی بار اسے حسن سمجھ کر گھورتے رہے۔

''بری تو نہیں'' انہوں نے جیسے پہلی مرتبہ دیکھ کر فیصلہ کیا۔

وہ آرام کرسی پر پڑے پڑے سوچ رہے تھے۔ کیا ہوا اگر اس کی عمر چالیس سے اوپر ہے۔ ڈھلتا ہوا سورج بہ نسبت چڑھتے ہوئے سورج کے زیادہ حسین و دلکش ہوتا ہے۔ آگے کے دو دانت ذرا بڑے ہیں لیکن ہونٹ تو پتلے اور سرخ ہیں۔ سرخی چاہے پانوں ہی کی ہو۔ خیر قدرتی سرخی تو کسی عورت کے ہونٹوں پر ہوتی ہی نہیں۔ جسے بھی دیکھو منوں لپ اسٹک کے استر ہونٹوں پر چڑھائے پھرتی ہے اس کے چہرے پر جھریاں ضرور ہیں مگر بھئی جسے ہر روز توندیل للو مارتا پیٹتا ہو۔ وہ بھلا چکنا چپڑا رہ سکتا ہے۔ ان سب کے علاوہ گورا

رنگ تمام عیبوں کی پردہ پوشی کرتا ہے خواہ وہ پتنامٹی کی طرح پیلا ہی کیوں نہ ہو۔ اس سے بھی قطع نظر وہ عورت ہے سراپا حسن!

وہ خود کو ملامت کرنے لگے کہ آخر اتنے عرصے تک وہ اس سے بے خبر کیوں رہے؟ چڑیا ان کے اردگرد پھدکتی رہی اور انہیں اس کے پکڑنے کا خیال ہی نہ آیا۔ کیا معلوم چڑیا اسی لیے ان کے اردگرد پھرتی ہو کہ وہ پکڑی جائے۔ کسی کا مقولہ ہے کہ عورت معمہ ہے۔ ممکن ہے وہ کھوسٹ للو سے اکتا کر خط لکھوانے کے بہانے ان سے پینگ بڑھانا چاہتی ہو۔ ورنہ یوں دیکھ دیکھ کر مسکرانا' اکیلے گھر میں بلا کر بٹھلانا' کیا معنی رکھتا ہے۔ اب ایسی تو بے حیا نہ ہو جائے گی کہ خود ہی پہل کرے گی۔ مگر واہ! وہ بھی کیا لاجواب بدھو رہے اب تک۔ آج انہیں اپنے دوست بڑے عقلمند معلوم ہو رہے تھے جنہوں نے انہیں بدھو کے خطاب سے نوازا تھا۔ لیکن اب سب باتوں کے باوجود لفظ چاچی ابھی تک بلی کی میاؤں کی طرح ان کی دسترس سے دور تھا۔ وہ بھی کتنا نامعقول رشتہ لگا بیٹھے تھے یعنی یہاں تو کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ انہیں الجھن ہونے لگی۔ مگر تھوڑی سی ادھیڑ بن کے بعد وہ بالکل مطمئن تھے' بات یہ تھی کہ ایک دن جب وہ چھیلا پنواڑی سے پان لینے گئے تھے تو وہ کسی سے کہہ رہا تھا کہ ''سالی سب کی چاچی بنی پھرتی ہے' میں جانو یا وہ جانے کہ للو ہر روز کیوں جوتے مارتا ہے' بس ایسی مہریا جو ہے۔'' اس دن تو انہیں چھیلا کی بات کچھ زیادہ وزنی معلوم نہ ہوئی لیکن آج وہ زبردستی ایمان لے آئے کہ ہاں کچھ یونہی سی عورت ہے۔ ورنہ کیا وجہ ہے کہ آئے دن للو سے لڑائی ہوتی رہے مگر وہ اس وقت یہ قصداً بھول گئے کہ ان کے ابا جان بھی ہفتے دو ہفتے میں ایک بار ضرور ان کی اماں سے زبانی جوتالات فرمالیا کرتے ہیں۔ غرض کہ ننھے میاں نے یہ فیصلہ تو اسی جگہ بیٹھے بیٹھے کرلیا کہ چاچی یونہی سی عورت ہے اور اب وہ بھی چند روز میں دوستوں سے اپنا رومان بیان کریں گے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اظہار عشق کجا ان کی شرم سر اٹھانے کی اجازت بھی دے گی؟ اونہہ' اب تو وہ بدھو رہنا پسند ہی نہیں کرتے۔ ہمت بھی کوئی چیز ہے۔ وہ جتنا زیادہ سوچتے گئے انہیں اپنے پہلے تجربے کی راہ میں آسانیاں ہی نظر آتی گئیں اور جب وہ دوپہر کا کھانا کھانے گھر میں گئے تو بدھو ننھے میاں صرف دوستوں کے دماغ میں محفوظ تھے۔ ورنہ اور کہیں ان کا وجود نہ تھا۔

وہ سہ پہر کی چائے سے الٹے سیدھے فارغ ہوئے۔ کافی دیر آئینے کے سامنے گزار کر خط لکھنے کے بہانے اپنے دھڑکتے ہوئے دل پر ایک رومانی کہانی لکھنے چلے۔

دکان پر للو حلوائی مٹھائیوں کے تھالوں کے پاس بیٹھا مکھیاں اڑا رہا تھا بیچارہ یہ تکلیف صرف یہ سوچ کر اٹھاتا تھا کہ کم بخت مکھیاں جلیبیوں کا کافی شیرہ چٹ کر جاتی ہے۔

''کیسے آئے بھیا؟'' وہ کھیسیں نکال کر بولا

''چاچی نے خط لکھوانے کو بلایا ہے۔'' ننھے میاں نے جواب دیا اور للو کا چہرہ سوج گیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ ننھے میاں سیر آدھ سیر مٹھائی اپنے یار دوستوں کے لیے لینے آئے ہوں گے۔ مگر یہ سن کر جان نکل گئی کہ تین پیسے کی فضول خرچی میں ہاتھ بٹانے آئے ہیں۔ فریادی ہوا کہ

''ارے بھیا! اس مہریا نے تو ناک میں دم کر رکھا ہے۔ بتاؤ میاں یہ ہر روج کا کھرچہ کہاں سے نکالوں؟ کام بالکل مندا ہے۔ لوگوں کو روٹی ملتی نہیں مٹھائی کون کھریدے گا۔ تس پر تمہاری چاچی کا یہ حال ہے۔''

ننھے میاں بڑی مسکینیت سے کھڑے سنتے رہے۔ حالانکہ محلے بھر میں مشہور تھا کہ للو نے اپنے ٹپرے کے نیچے ایک ہنڈیا گاڑ رکھی ہے۔ جس میں اشرفیاں ہی اشرفیاں ہیں۔

چاچی نے شاید گھر میں للو کی بھن بھن سن لی۔ لپک کر دوکان میں آئی لیکن ننھے میاں کو دیکھ کر مسکرانے لگی اور ننھے میاں کو ایسا معلوم ہوا کہ اسکی مسکراہٹ ان کے ارادوں کی کمک پر ہے۔

آؤ ننھے میاں!'' وہ بولی اور ننھے میاں کا دل اس دعوت پر بڑے زور سے اچھل پڑا۔ وہ ایک ہیجانی کیفیت میں اس کے ساتھ اندر چلے گئے۔

چاچی نے جلدی سے بانس کی کھاٹ دالان میں بچھا دی اور کوٹھری میں چلی گئی۔ ننھے میاں کھڑے کھڑے اپنی اسکیم پر غور کرنے لگے۔ چاچی کی دونوں سیانی لڑکیاں رسوئی گھر میں تھیں۔ وہ بابو اور منو کو مع رامی کے سڑک پر کشتم کشتا کرتے دیکھ آئے تھے۔ باقی بچیاں دالان کے کونے میں چیتھڑے گدڑے سمیٹے شاید گڑیاں کھیل رہی تھیں۔ سب سے چھوٹی بچی ہمیشہ کی طرح چاچی کے کولہے پر چپکی ہوئی تھی۔ چاچی بھن بھن کرتی کوٹھری سے نکلی اور پوسٹ کارڈ بڑھا کر بولی۔ ''بیٹھو''

ننھے میاں نے ماحول کو سازگار بناتے ہوئے کہا۔ ''یہاں دھوپ کی تپش ہے۔''

''تو اندر کوٹھری میں آجاؤ'' چاچی نے جھپ سے کھاٹ اٹھا کر نیم تاریک کوٹھری میں ڈال دی اور ننھے میاں کچھ متوحش سے بیٹھ گئے۔ ان کے ہونٹوں پر پپڑیاں بندھی ہوئی تھیں۔ چاچی کوٹھری کی دہلیز پر بیٹھ گئی۔

ننھے میاں کا دماغ بالکل ماؤف ہو رہا تھا۔ انہوں نے کئی گھنٹوں کی ادھیڑ بن کے بعد عشق کا ڈرامہ تیار کیا تھا۔ اس میں پارٹ کرنے کی ان میں ہمت ہی نہ تھی۔ پھر بھی وہ دماغ پر زور دے کر اپنے مکالمے یاد کرنے لگے۔ مگر برا ہو گھبراہٹ کا' کوئی ڈھنگ کی بات نہ یاد آئی۔ بہرحال آج وہ یوں تو نہ جائیں گے۔

’’زمین پر کیوں بیٹھ گئیں؟‘‘ انہوں نے اپنے حلق سے اس طرح آواز نکالی جیسے ان کی گدی پر کوئی گھونسے مار رہا ہو۔

’’ٹھیک بیٹھی ہوں‘‘ وہ مسکرا رہی تھی۔

’’تو پھر نہیں لکھتا خط‘‘ انہوں نے اپنے حساب گویا کوئی بہت ہی رومانی جملہ ادا کیا اور ہنسنے لگا۔

’’اچھا لو‘‘ وہ مع اپنی لونڈیا کے کھاٹ پر آ گئی اور ننھے میاں کی ناک میں کھٹی کھٹی بساند چڑھ گئی۔ وہ بے اختیاری میں اس کی طرف کھسک گئے۔

’’لکھو‘‘ وہ بولی۔

’’ٹھہرو‘‘ انہوں نے اپنا چکراتا ہوا سر پکڑ لیا۔

’’کیسی طبیعت ہے؟‘‘ چاچی کچھ گھبرائی ہوئی سی تھی۔

’’مجھے تم سے محبت ہے؟‘‘ آخر انہوں نے اس کے سوال کے جواب میں چڑھی ہوئی سانس کے درمیان اگل ہی دیا اور پھر اپنا ہاتھ بڑھا کر چاچی کے گردن میں لپیٹ لیا۔ چاچی بالکل نہ جھجکی۔ بلکہ اس نے بھی اپنا ہاتھ ان کی کمر میں ڈال دیا۔ ننھے میاں جیسے ہوا پر اڑ رہے تھے۔ ان کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ چاچی کی لونڈیا دودھ پینے میں لگی تھی۔

’’مجھے تم سے پریم ہے۔‘‘ انہوں نے جیسے سوتے میں کہا۔

’’ہاں تم مجھے چاچی جو سمجھتے ہو۔ پر میں تم سے دوسرا ہی پریم کرتی ہوں۔‘‘

ننھے میاں کا دھڑکتا ہوا دل جیسے ٹھہر کر ہمہ تن گوش ہو گیا۔ شاید اب وہ کہے گی۔ ’’ایسا پریم جو ننھی کے باپ کو بھی نصیب نہیں۔‘‘

چاچی اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہنے لگی۔

’’بھگوان جانتا ہے ننھے میاں! تمہیں دیکھ کر مجھے اپنا پہلوٹھی کا لڑکا یاد آتا ہے۔ جیتا ہوتا تو اتنا ہی بڑا ہوتا۔ پھر کاہے کو میری یہ گت ہوتی۔ آج کو میں راج کرتی ہوتی۔‘‘ چاچی کی آواز آنسوؤں کے سیلاب میں بہہ گئی اور ننھے میاں ہوا پر اڑتے اڑتے دھم سے زمین پر آ گئے۔ ان کا ہاتھ چاچی کے گردن میں جھول رہا تھا اور انہیں چاچی کی گرفت اپنی کمر کے گرد سخت معلوم ہو رہی تھی۔

◆◆◆

تل اوٹ پہاڑ

میں اور وہ ایک ہی ہوٹل میں برابر کے کمروں میں مقیم تھے۔ لیکن ایک دوسرے سے قطعی ناواقف‘ وہ زیادہ تر اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی دکھائی دیتی زردی مائل سفید رنگت‘ دبلی پتلی سی‘ اس کے چھوٹے چھوٹے سنہری بال جو بالکل خشک اور سیدھے سے تھے‘ ہمیشہ پشت پر بکھرے رہتے۔ عمر بھی کوئی دس گیارہ سال ہوگی لیکن معصومیت نام کو نہیں۔ عجیب پھیکا اور کھرا چہرہ تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے سفید کھارے شلجموں کا مزا یاد آ جاتا۔ بس میں نے اسے جھجکی جھجکی نظروں سے اسی قدر دیکھا تھا۔ کیونکہ کم بخت کے سامنے نظر اٹھانے کی ہمت پڑتی ہی نہ تھی۔ ناٹنگ برابر کی لونڈیا‘ کچھ اس طرح آنکھیں گاڑ گاڑ کر دیکھتی جیسے زبردستی میری صورت‘ لباس اور چال ڈھال میں کوئی عیب نکالنا چاہتی ہو اور یہ محسوس کر کے میرے جسم میں چیونٹیاں سی کاٹنے لگتیں۔ بس یہی دل میں آتا کہ کم بخت کے کان کھینچ کر لگاؤں دو چانٹے تا کہ آئندہ باہر نکلتے ہوئے مجھے یوں نہ تاکا کرے۔ لیکن اس کا رعب کچھ ایسا تھا کہ اپنا ہی جی جلا کر رہ جاتی۔ ہوگا بھئی دیکھنے دو۔ میرا کیا جاتا ہے۔ اس کی آنکھیں دکھیں گی۔ میں جلے پر مرہم رکھ لیا کرتی۔ مگر یہ لڑکی ہے بالکل معمہ۔ اگر میں اسے اچھی لگتی ہوں تو بجائے بدتمیزی سے گھورنے کے مجھ سے دوستی کیوں نہیں کرتی۔ اتنے اتنے بڑے بچے تو بلا تکلف اپنی پسندیدہ چیزیں دوسروں کے ہاتھوں سے جھپٹ لیا کرتے ہیں نہ کہ یہ..... ہوگا۔ مجھے کیا مطلب اس معمے؟ ڈاکٹر کی ویسے ہی ہدایت ہے کہ پہاڑ پر رہو‘ آرام کرو۔ سوچ بچار سے بچو۔ مطلب یہ کہ سطح زمین سے اونچے ہونے کے باوجود ہو قابل غور چیز کو سطح دماغ کے نیچے دبا دو۔ ارے ہاں! جب اپنی صحت ہی خراب ہو تو پہلے فکر اس کی کرنا چاہیے۔‘‘ اور میں بڑی کوشش کے بعد اس لڑکی کی طرف سے بے نیاز ہو جاتی۔

چونکہ میں پہاڑ کی آب و ہوا کی عادی نہ ہوئی تھی۔ دوسرے علاج اور پرہیز میں بھی کافی بے توجہی تھی۔ اس لیے سزا تو ملنا ہی تھی۔ زکام ہوا‘ کھانسی بڑھی اور سینے کا سویا ہوا درد بھی جاگ پڑا۔ ممانی جان اور بھائی جان پروگرام کے مطابق سینما جانے کے لیے تیار ہو چکے تو مجھے سوالیہ نظروں سے متواتر دیکھا جانے لگا۔ کیونکہ میں بجائے ساتھ جانے کے پلنگ پر پڑی تھی۔

’’آپ لوگ جائیے‘ میں نہ جاؤں گی۔‘‘

''کیوں؟'' دونوں نے چڑ کر کے بعد دیگرے سوال کیا۔

سچی بات کہتے ڈر لگا۔ کیونکہ سچ بولنے کے صلے میں سوائے بد پرہیزی کے طعنوں کے کچھ ملنا نہ تھا۔ اس پر اماں کو شکایت لکھنے کی دھمکی بھی دی جاتی' اور پھر اماں کا خط۔ ''تم بڑی خراب لڑکی ہو۔ تمہیں اپنا ذرا بھی خیال نہیں۔'' میں جھوٹ بولنے پر تل گئی۔

''وہ دیکھئے نا! ذرا آج ایک پیاری سی کتاب ختم کرنے کا ارادہ ہے' اور ذرا اس وقت موج میں ہوں۔ تھوڑا گنگناؤں گی بھی۔ اور ایک بات یہ بھی ہے کہ دو ڈھائی گھنٹے سینما ہال میں بند رہنے سے۔ میرا مطلب ہے کہ میری صحت پر برا اثر ہوگا۔ دوسرے میری آنکھیں۔ عینک بھی تو ٹوٹ گئی ہے۔''

میں نے درد سے بیتاب ہو کر تکیہ سینے سے بھینچتے ہوئے جھوٹ کا طومار باندھ دیا۔

''اوہ بڑی اچھی لڑکی ہو تم'' بھائی جان نے بیوقوف بننے میں پہل کی۔

''اچھا تو دروازہ بند کر لو۔ ہم جا رہے ہیں۔'' ممانی جان بھی صاف چکمے میں آ گئیں۔

تنہائی میں اطمینان سے میں نے اپنی بیماری کا سوگ منانا شروع کیا۔ یا تو ابھی تک مارے ڈر کے منہ سے ہوں بھی نہ کی تھی یا اب۔

''اللہ بابا۔'' مجھے مارے تکلیف کے رونا آنے لگا۔ یہ درد' کھانسی کیا ہو گیا ہے مجھے؟ جس ڈاکٹر کے پاس جاؤ وہ سینہ اور پیٹھ ٹھونک بجا کر کہہ دیتا ہے۔ ''کچھ نہیں' کوئی بات ہی نہیں۔ بس ذرا اس دوا کی دو چار شیشیاں پی ڈالو' خوب کھاؤ پیو' غور و فکر کرنا چھوڑ دو۔ بس اچھی ہو۔'' غضب خدا کا! درجنوں ڈاکٹروں کی درجنوں شیشیاں پی ڈالیں لیکن دو چار شیشیاں باقی ہی رہیں اور یہ جو بدتمیز کہتے ہیں ''کچھ نہیں'' تو پھر کھانسی اور درد کا کوئی نیا نام ہوگا ان کی لغت میں۔ کسی کا کیا جائے گا' بس میں ہی کسی دن مر جاؤں گی۔ میں نے گھٹ کر اپنا منہ ملائم تکیوں میں بھینچ لیا اور پھر جو اٹھی کھانسی تو ہوش غائب' لیکن فوراً ہی میں کسی کے ہاتھ کا لمس اپنی پیٹھ پر محسوس کیا اور کھانسی کے جھٹکوں کی لائی ہوئی چکا چوند کے باوجود میں نے دیکھا کہ وہی لڑکی مجھ پر جھکی ہوئی ہے اور اس کے خشک سنہرے بالوں کی کچھ لٹیں کندھوں سے ڈھلک کر میرے اوپر جھول رہی ہیں۔

''یہ لڑکی' معمہ' چھکی' کھری' بدتمیز..... نہیں بھئی کچھ نہیں۔ ذرا سنجیدہ ہے اور اپنی عمر سے زیادہ عقلمند..... ویسے تو کبھی اس نے بات نہ کی۔ لیکن دیکھو اس موقع پر الٹا مجھی کو اس کا ممنون ہونا پڑا۔ یہ عقلمندی نہیں تو اور کیا ہے؟''

میں اٹھنے لگی۔

''تم لیٹی رہو نہیں تو پھر کھانسی آنے لگے گی۔'' اس نے بڑی بے تکلفی سے کہا۔ اور پیار سے میری بکھری ہوئی لٹیں درست کرنے لگی۔

''تم'' یہ طرز تخاطب مجھے کھلا خیر!

''کیا بیماری ہے تمہیں؟'' اس نے فکر مند ہو کر پوچھا۔

''کچھ نہیں''

''ایں'' یہ اظہار تعجب تھا۔

''میری بیماری کا نام ڈاکٹروں نے یہی بتایا ہے۔'' میں نے وضاحت کر دی۔ اس کا تعجب مسکراہٹ میں تبدیل ہو گیا اور اس نے اپنی بڑی بڑی لیکن بے کیف سی آنکھیں نچا نچا کر ڈاکٹروں کی حماقت کے کئی قصے مجھے سنا ڈالے۔ اب میرے درد کو بھی نیند آ رہی تھی۔ اس لیے ادھر ادھر کی سوجھنے لگی۔

''کیا نام ہے تمہارا' اور یہاں کس کے ساتھ ہو؟'' میں نے پہلا سوال کیا۔

''زرینہ...... اپنے ابا کے ساتھ ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''تمہارے ابا تمہیں بہت چاہتے ہوں گے۔'' میں بچوں سے یہ سوال اکثر کرتی ہوں۔ بلا مقصد ہی تو۔

''اوں' ہنک'' وہ ہونٹ لٹکا کر خلا میں کچھ گھورنے لگی۔ ''وہ تو ہمیں جلانے کے مارے لال لال ہونٹوں والی تمہارے برابر کی لڑکیوں کو چاہتے ہیں۔ خیر! جب ہم بھی اتنے ہی بڑے ہو جائیں گے تو دیکھیں ہمیں کیسے نہیں چاہتے۔''

میں کٹ کر رہ گئی۔

''تمہاری اماں کہاں ہیں؟'' میں نے اسے خاموش دیکھ کر سوال کیا۔

''مر گئیں وہ'' اس نے اس طرح کہا جیسے اس کو اماں کے مرنے پر غصہ آ رہا ہو اور میں پریشان ہو گئی۔ خواہ مخواہ رنجیدہ کر دیا بیچاری کو میں نے۔ اب بہلاؤں۔

''بھئی تم بڑی اچھی لڑکی ہو' کیا تم یہاں پہلی مرتبہ آئی ہو؟''

''نہیں ہم ہمیشہ گرمیوں میں یہاں آ جاتے ہیں۔'' وہ میری انگلیوں سے کھیلنے لگی۔

''تمہاری انگلیاں بہت اچھی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی بچوں جیسی۔'' اس نے میری انگلیاں اپنے ہاتھوں میں بھینچ لیں اور ہنسنے لگی۔ اس

کے کہنے پر جو میں نے اپنی انگلیاں دیکھیں تو مجھے بڑی ہی اچھی لگیں' میں بے ساختہ مسکرا دی۔

''اور تمہارا چہرہ بھی خوبصورت ہے۔'' اس نے اپنی گہری گہری آنکھیں مجھ پر گاڑ دیں اور میں ذرا بولائی۔ جھوٹ بول رہی ہے کم بخت ابھی ذرا دیر پہلے میں نے اپنی صورت آئینے میں دیکھی تھی تو کتنی بری لگی تھی۔ صحت بھی تو خراب ہے۔

''سچ مانو تم بڑی پیاری لگتی ہو مجھے۔'' اس نے میرے چہرے کو اپنی ہتھیلیوں میں ہولے سے دبا لیا اور وہ بہت سنجیدہ ہو گئی۔ چہرے پر وہی کھرا پن خم ٹھونک کر جھومنے لگا اور مجھے ہوئی الجھن۔

''تم ہنستی رہا کرو۔'' میں نے گھبرا کر کہا۔ ''مجھے سنجیدہ بچوں سے بڑی نفرت ہے نا۔''

''اچھا'' وہ اپنے نچلے ہونٹ کا ایک گوشہ دبا کر مسکرانے لگی۔

''زری! اے زرینہ!'' یہ اس کے باپ کی آواز تھی جو اسے عجیب انداز سے پکار رہا تھا۔

''اب تمہاری طبیعت تو اچھی ہے نا؟ میں جاؤں؟'' وہ مجھ پر پیار سے جھک گئی۔

''ہاں ہاں جاؤ! تم بڑی اچھی لڑکی ہو۔'' میں نے کہا۔

دھڑ دھڑ..... دھم دھم' متصل کمرے میں اس کا باپ نہ جانے کیا اٹھا دھری کر رہا تھا۔ روز رات کو یہی اودھم ہوتا۔ اسی لیے تو بھائی جان ہوٹل کے قیام سے کچھا کر رہنے کا دوسرا انتظام کر رہے تھے۔

''یہ تمہارے ابا اتنا اودھم کیوں کرتے ہیں؟'' میں نے لگے ہاتھوں یہ بھی پوچھ لینا مناسب سمجھا۔

''وہ جو آتی ہیں نا بڑی بڑی لڑکیاں' وہ روز رات کو انہیں بہت سا شربت سوڈے میں ملا ملا کر پلا دیتی ہیں اور ابا کو شربت بہت اچھا لگتا ہے۔ اس لیے اکیلے سب پی جاتے ہیں اور جب ان کا پیٹ بھر جاتا ہے تو مارے خوشی کے بڑے مزے مزے کی حرکتیں کرتے ہیں۔ ایک دن تو انہوں نے ایک لڑکی کی ساری......''

''زری او زری کی بچی!'' ساتھ ہی ایک باریک قہقہے کی آواز گونجی اور وہ اپنی بات پوری کیے بغیر جلدی سے بھاگ گئی۔

دوسرے دن سویرے میرے کمرے میں وہ پھر آئی۔ لیکن میں سو رہی تھی۔ اس لیے چلی گئی۔ یہ مجھے ممانی جان نے بڑی حیرت سے بتایا تو میں نے انہیں اپنی اور اس کی دوستی کی ابتدا سنا دی۔

''ہاں وہی تو میں کہوں'' ممانی جان نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ میرے کمرے کے سامنے سے گزری تو میں نے اسے بلا لیا۔ بڑی دیر تک بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ اس کے بعد

تو بقول اس کے میری اس کی پکی دوستی ہو گئی۔ وہ تقریباً تمام دن میرے پاس گھسی رہتی۔ نہ جانے اسے کتنی باتیں کرنا آتیں۔ بس بیٹھتی تو جھڑ لگا دیتی اور بعض بعض باتیں تو اتنی عجیب کہہ جاتی' کہ میں منہ دیکھ کر رہ جاتی۔ وہ تو کچھ اپنی عمر سے زیادہ سوچتی اور بولتی اور مجھے ہوتی الجھن۔ لیکن میں اس کے ڈھڈھوپن پر ٹوک بھی نہ پاتی۔ کیونکہ وہ تو بے بات کی بات پر رنجیدہ ہو جایا کرتی۔ دوسرے وہ مجھے چاہتی بھی اتنا تھی کہ میرا منہ نہ پڑتا کچھ کہنے کو۔ ایسا دوڑ دوڑ کر میرا سب کام کرتی کہ کوئی دو ٹکے کا غلام بھی نہ کرے۔ بس ہر وقت میرا منہ دیکھا کرتی کہ کہیں میں ناراض تو نہیں ہوں اس سے۔ ہم دونوں اکثر ساتھ ہی چہل قدمی کو نکل جاتے تو وہ راستے بھر ایسی کھری بنی رہتی کہ میں قدم قدم پر یہی سوچتی کہ آج اس سے کہہ دوں کہ میری تمہاری دوستی ختم۔

''تم ادھر ادھر نہ دیکھا کرو۔'' وہ کہتی۔

''کیوں؟'' میں جل جاتی۔

''لوگ تمہیں گھورتے ہیں۔''

''تو میرے ادھر ادھر نہ دیکھنے سے لوگ گھورنا چھوڑ دیں گے کیوں؟''

نہیں' مگر تم کو تو نہیں معلوم ہو گا کہ لوگ تمہیں دیکھ رہے ہیں۔'' وہ جواب دیتی اور مجھے ایسا لگتا کہ کسی نے مجھ پر گرم گرم بھوبل انڈیل دی۔ جی میں آتا کہ مارے تھپڑوں کے منہ سرخ کر دوں کمبخت کا۔ لیکن پھر وہی رعب۔ دل ہی دل میں اپنے بلاوجہ دبنے پر تاؤ کھاتی رہتی اور تفریح کا مزا کرکرا ہو جاتا۔

''اب واپس چلیں گے۔'' میں بیزار ہو کر کہتی اور وہ میرے محافظ کی طرح کبھی میری نظریں اور کبھی دیکھنے والوں کی نظریں دیکھتی سائے کی طرح ساتھ رہتی۔ لیکن جائے قیام پر پہنچ کر اس کا کھرا پن اس طرح لجاجت میں تبدیل ہو جاتا کہ میں دوستی ختم کرنے کا اعلان نہ کر پاتی۔

صبح سے جی کچھ اداس تھا۔ ممانی جان اپنی ہی جیسی موٹی تازی پرانی دوست کے ساتھ پہاڑیوں پر چڑھنے کی مشق فرمانے گئی ہوئی تھیں اور بھائی جان تو تفریح کرنے ہی کے خیال سے آئے ہوئے تھے۔ اب میں تھی اور میرے الجھتے ہوئے خیالات۔ اتنے میں وہ آ گئی۔

''چپ کیوں پڑی ہو؟''

''یونہی'' اس کا آنا کھل رہا تھا اس وقت۔

''کنگھی کیوں نہیں کی آج؟ بالکل جھونجھ ہو رہے ہیں بال۔''

اس نے اپنی انگلیاں میرے بالوں میں الجھائیں۔

''جی نہیں چاہا۔''

تولاؤ میں کردوں کنگھی'' وہ جھپٹ کر سنگھار میز پر سے کنگھا اٹھالائی۔

''نہیں بھئی مجھے لیٹا رہنے دو۔ میری طبیعت نہیں اچھی' اس وقت۔'' سچ مچ جان نکل سی رہی تھی۔

''تم لیٹی رہو' میں کردوں گی کنگھی۔'' وہ بڑی خوشامد سے بولی اور میری چوٹیاں کھولنے لگی۔

''ارے!'' میں نے پھریری لے کر اپنے بازو سکیڑے۔

''کیا؟'' اس نے اپنی پتلی سی زرد گردن کو کندھے کی طرف جھٹکا دے کر کہا اور مسکراتے ہوئے بے رنگ لبوں کو بھینچ کر تھوک نگلا۔
اب وہ احتیاط سے چوٹیاں کھول رہی تھیں۔

مجھے اپنی ''ارے'' پر بڑی خفت ہوئی۔

وہ آہستہ آہستہ میری لٹوں میں کنگھا پھیرنے لگی اور میری آنکھیں سرور سے بند ہونے لگیں۔ یہ بھی میری عجیب عادت ہے کہ جہاں کسی نے میرے بالوں کو چھوا اور مجھے نیند آئی۔ اس کا ہاتھ کنگھی کرتے کرتے رکا اور میرے چہرے پر پھرنے لگا اور پھر اچانک میں نے اس کی تپتی ہوئی سانس اپنے چہرے پر اور جلتے ہوئے ہونٹ اپنے ہونٹوں پر محسوس کیے۔ میرے ٹھنڈے جسم کی رگوں میں چنگاریاں سی کلبلائیں اور میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

''تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔'' اس نے میرے چہرے کو اپنی سلگتی ہوئی ہتھیلیوں میں زور سے بھینچا اور میں بغیر سوچے سمجھے اپنے اوپر ناز کرنے لگی۔

''تم یہاں کب تک رہو گی زری؟'' میرا جی چاہا کہ وہ مجھ سے کبھی بھی جدا نہ ہو۔ جب تک تم رہو گی۔ تمہارے بغیر یہاں میرا جی گھبرائے گا۔'' وہ اپنے خشک ہونٹ کی ایک پپڑی دانت سے دبا دبا کر ادھیڑنے لگی۔

''تمہارے ہاں تو بہت سی لڑکیاں آتی ہیں۔ ان سے دوستی کرلو پھر جی نہ گھبرائے گا۔'' میں نے یونہی کہہ دیا۔

''اوں ہنک! وہ سب کی سب بڑی نک چڑھی ہیں۔ بس وہ سب تو ابا کے پاس گھس گھس کر بیٹھتی ہیں اور۔'' اس کے چہرے پر سے بھولپن صاف کھرچ گیا۔

''بھئی دوسری باتیں کرو۔'' میں نے گھبرا کر بات کاٹی۔ وہ ہنس پڑی۔ بالکل اس طرح جیسے کوئی کسی بچے کو ''جوجو'' سے ڈرا کر

خوش ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنی ان سہیلیوں کا ذکر کرنے لگی۔ جن سے وہ بہت محبت کیا کرتی تھی۔ ان لڑکیوں کا ذکر کرتے ہوئے اس کی آنکھیں اور چہرہ اتنا عجیب ہوگیا کہ مجھے وحشت ہونے لگی۔

''لاؤ کنگھا مجھے دو' میں بال ٹھیک کرلوں' تم تو باتوں میں لگ گئیں۔ میں نے اسے دوسری طرف متوجہ کرلیا اور وہ اپنی سہیلیوں کو بھول کر میرے بالوں سے الجھ گئی۔

اس کے بعد سے تو یہ اس کا معمول ہو کر رہ گیا کہ گھنٹوں میرے بال سنوارا کرتی۔ ابھی اپنی مرضی کے بال بنائے اور دور کھڑے ہو کر ہر زاویے سے معائنہ کیا اور لو۔

''اس سے اچھے بناؤں گی۔'' پھر بنائے جانے لگتے بال۔ ایک دن تو اس نے غضب ہی کر دیا یعنی ایک پوری لٹ قینچی سے اڑا دی اور ننھے ننھے ترشے ہوئے بال جھومر کی طرح پیشانی پر بکھیر کر خوب ہی تو خوش ہوئی۔ میں جب ناراض ہوئی۔ تو اس نے لپٹ کر سینکڑوں پیار کر ڈالے۔ یہاں تک کہ میرا دم گھٹنے لگا۔

''ہٹو الگ'' میں نے اکتا کر اسے الگ کرنا چاہا۔

''اوں.... اوں..... نہیں'' وہ اور بھی لپٹی اور میں نے جھنجھلا کر اسے بازوؤں سے پکڑ کر دھکا دے دیا۔ وہ دھان پان لونڈیا ذرا ہی دیر میں دیوار سے جا ٹکرائی۔ میرا دل دھک سے ہوگیا کہ کہیں چوٹ نہ لگ گئی ہو۔

''چچ چچ'' میں مارے پشیمانی کے ہونٹ کاٹنے لگی۔ اب وہ مجھ سے ناراض ہو جائے گی۔ کتنی ذلیل ہوں میں بھی کہ اس کی محبت کا یہ صلہ دیا۔

میں نے ڈرتے ڈرتے نظر اٹھائی تو دیکھا۔ وہ دیوار سے لگی مجھے عجیب عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ہاں کچھ بڑی عجیب سی نظروں سے۔ کیا بتاؤں وہ کس قسم کی نظریں تھیں۔ اس کی ٹھوڑی سینے پر جھکی ہوئی تھی اور خشک سنہری بال کندھوں سے لے کر سینے تک بکھرے ہوئے تھے اور اس کا چہرہ! بالکل کسی جوشیلے نوجوان کی طرح کرخت اور وحشت زدہ ہو رہا تھا۔ میں جہاں تھی وہیں کھڑی رہ گئی۔

''سنو!'' وہ بڑے رعب سے کہتی ہوئی بڑھی۔ ''اب ایسا کبھی مت کرنا۔ ورنہ!'' اور پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ میری کمر کے گرد لپیٹ کر اپنا سر میرے سینے پر جھکا لیا۔ میں کس قدر غصے میں بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ اس کا سر دوبارہ دیوار سے ٹکرا دوں۔ آخر یہ مجھ پر رعب گانٹھنے والی ہوتی کون ہے۔ لیکن اچانک میں نے محسوس کیا کہ کوئی گرم رقیق چیز میرے سینے

میں جذب ہوتی جارہی ہے۔ ارے! وہ تو سسک کر رو رہی تھی۔ اوہ! میں پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ میں نے سوچا۔

''میں بھی کتنی بیوقوف ہوں' کیا انٹ شنٹ باتیں سوچتی ہوں۔''

اس کی سسکیاں تھم گئیں۔ لیکن وہ لپٹی اسی طرح رہی۔ بالکل ایک سہمی ہوئی ننھی بچی کی طرح۔

دروازہ کھٹ سے ہوا اور وہ پھرتی سے دور جا کھڑی ہوئی۔ ''ایں! یہ کیا؟ میں ہکا بکا رہ گئی۔ کمرے میں آنے والی ممانی جان تھیں جو اپنے گیلے بالوں سے پانی کی بوندیں تولیہ میں جذب کرنے میں منہمک تھیں۔

بڑی جلدی نہالیں آپ؟ اس نے ممانی جان کو گھورا۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک بار میں نے اپنے پالتو کتے کے آگے گوشت کا ایک ٹکڑا پھینک کر پھر شرارت سے اٹھالیا تو کتے نے مجھے گھورا تھا۔ مجھے اس کی صورت سے وحشت ہونے لگی۔ میں اس کی طرف سے منہ پھیر کر کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگی۔

''کیسی لڑکی ہے یہ؟'' میرے دماغ میں بس یہی سوال ٹھونگیں لگانے لگا۔

''ادھر کیوں کھڑی ہو؟'' وہ پھر میرے پاس آ گئی اور مجھے ایسا لگا کہ میرا جی اندر سے متلا رہا ہے۔ ایک عجیب سی تکلیف۔ بس جیسے جسم کے ایک ایک رونگٹے پر کراہت آمیز گدگدی چھا گئی۔

''جاؤ بھئی۔ اس وقت مجھ سے مت بولو۔'' میں ایک دم تاؤ میں آ گئی اور وہ تھوڑی دیر تک مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کے بعد خاموشی سے چلی گئی۔ مجھ پر سے جیسے بوجھ اتر گیا۔

پھر وہ تمام دن میرے پاس نہ آئی۔ میں دن میں کئی بار اس کے کمرے کے سامنے سے نکلی لیکن دروازہ بند ہونے کی وجہ سے وہ نظر نہ آئی۔

''بچہ ہی تو ہے۔'' میں اپنے دل کو سمجھاتی لیکن دل کے کسی گوشے میں دبکا ہوا نامعلوم سا خوف مجھے منہ چڑا دیتا اور میں سوچنے لگتی۔ ''اونہہ اچھا ہی ہے کہ ناراض رہے مجھ سے۔ مجھے نہیں ملنا ہے ایسی لڑکی سے۔ مگر وہ ہے کیسی لڑکی؟'' اس کا جواب میرے پاس کیا تھا؟ سوائے اس کے کہ تمام دن مارے الجھن کے دماغ آبلے کی طرح تپکتا رہا اور رات چڑھا کس کے بخار۔ اللہ! ذرا آ جاتی تو میرا سر دبا دیتی۔ زری آ جاتی تو میرے بال ہی سلجھا دیتی۔ سر پر بوجھ ہو رہا ہے۔ زری آ جاتی تو۔''

اب زری کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ لیکن وہ نہ آئی۔ رات گئے تک میں بن بن کر کھانستی رہی کہ شاید..... صبح ہو گئی' بخار دھیما پڑ گیا اور غصہ تیز ہو گیا۔ ''نہیں آتی تو نہ آئے کم بخت! کیا میں کہیں کی گری پڑی ہوں۔ دوسرے اس میں رکھا ہی کیا ہے؟ زری

بدتمیز تو ہے اور جانے مجھے اپنی جی میں سمجھتی کیا ہے جو کھلونا بنا رکھا ہے۔''

دوسرا دن بھی میں نے پیچ و تاب کھاتے گزارا۔ شام کو خلاف امید بخار کے ساتھ ساتھ وہ بھی آ گئی۔ بڑی خوبصورت سی فراک پہنے ہوئے تھی اور خشک سنہری بالوں کو بڑی تمیز سے سرخ ربن میں باندھ رکھا تھا۔ اس کا دبلا پتلا روکھا سا چہرہ بجلی کی سفید روشنی میں مجھے بڑا بھلا لگا۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر ایک کرسی پر بیٹھ کر بے نیازی سے ٹانگیں جھلانے لگی۔

''دیکھا! کیا اسے نہیں معلوم کہ میں بیمار ہوں۔'' میرا جی بھرانے لگا اور آنکھیں تپنے لگیں۔

''آج تو تم دو روز بعد آئی ہو زری! کیوں بھئی؟'' ممانی جان نے سویٹر بنتے ہوئے کہا اور اپنی چوڑے چکلے چہرے پر اس طرح مسکراہٹ لائیں کہ ان کے چہرے کی جلد چٹختی ہوئی لگنے لگی۔

''مجھے آپ پر غصہ تھا۔'' اس نے اپنے بے رنگ لبوں کو بڑے انداز سے کھولا۔

''کیوں بھئی کیوں؟'' ممانی جان ہڑبڑا گئیں۔

''آپ اچھی طرح نہیں نہاتیں۔'' وہ بولی اور میرے دل پر چھایا ہوا غبار آناً فاناً یہ معصوم جھونکا لے اڑا۔

''میں بھی کتنی وہمی ہوں۔ خواہ مخواہ تنکے کو گھور رہی ہوں کہ کہیں یہ پہاڑ نہ ہو لو بھلا تنکا پہاڑ کیسے ہو جائے گا۔ اماں سچ کہتی ہیں کہ تمہارا سوچ بچار تم کو بالکل نکما کر دے گا۔ تم تو ساری عمر میں زیادہ سے زیادہ یہی سوچ سکتی ہو کہ چلتے میں انسان کے پاؤں آگے پیچھے نہ پڑیں تو کس صورت سے پڑیں۔'' میں بے ساختہ مسکرا پڑی۔

''اچھا اچھا...... مجھ پر غصہ بعد میں کر لینا پہلے اپنی شاداں کی فکر کرو۔ تمہارے لیے اتنی اداس رہی کہ بخار چڑھا لیا۔'' ممانی جان کا کرارا قہقہہ گونجا اور میرا دل اس کا جواب سننے کے لیے زور سے دھڑکنے لگا۔

وہ ہنستی ہوئی میرے بستر پر آ بیٹھی۔

''تو تم سچ مچ اداس رہیں میرے بغیر؟'' اس نے میری انگلیاں زور سے دبا کر چھوڑ دیں اور مارے غرور کے بھنویں تان لیں۔

''اوں' ہنک!'' میں نے بطور انکار گردن ہلا دی۔ اس وقت میرا جی چاہ رہا تھا کہ خوب ستاؤں کم بخت کو۔ اس نے بھی مجھے بہت جلایا تھا نا۔ اس کے چہرے کی تمتمائی ہوئی کھال ایک دم ڈھیلی پڑ گئی اور وہ میری طرف سے منہ پھیر کر ممانی جان کو دیکھنے لگی جو ہماری طرف سے پیٹھ موڑے الماری سے کچھ نکالنے میں جٹی ہوئی تھیں۔ میں نے اس کی انگلیاں مروڑ ڈالیں کہ یوں ہی لٹکا ہوا منہ سدھر جائے اور وہ تو جیسے اپنا غصہ رفو چکر کرنے پر ادھار کھائے بیٹھی تھی۔ بس میری اس فضول سی ادا پر اس کا پیار پھٹنے لگا۔ اس سے پہلے کہ

ممانی جان مڑیں۔ اس نے میرے چہرے کو اپنے جلتے ہوئے چہرے سے داغنا شروع کر دیا۔ لیکن ادھر ممانی جان مڑیں اور ادھر وہ کھٹ سے سیدھی ہو بیٹھی۔

''پھر وہی؟'' میرا دل ایک جھٹکے سے پسلیوں سے جا لڑا۔ آخر یہ چوری کیسی؟ میں نے الجھ کر اسے گھورا۔ اس کے اوپر کے ہونٹ پر پسینہ چمک رہا تھا اور میرے ہاتھ پر رکھا ہوا ہاتھ پسیج رہا تھا۔ وہ تو جیسے.....

''کیسی ہے یہ لڑکی؟'' کھٹ کھٹ دماغ پر چوٹیں سی لگنے لگیں' آنکھیں آپ ہی آپ ماند پڑ گئیں اور ممانی جان کی ایک ہلکی سی گھبراہٹ آمیز چیخ سننے کے بعد مجھ پر ایک عجیب سا خواب طاری ہو گیا۔

''کرخت' دبلا پتلا لڑکوں جیسا چہرہ' ناقابل بیان قسم کی نظریں' بے رنگ پپڑیائے ہونٹ اور پسیجے ہوئے ہاتھ۔'' میں کپکپا رہی تھی۔ اے لو! وہ ایک کھرا چہرہ کتنے بہت سے چہروں میں تبدیل ہو گیا۔ بالکل ایک جیسے سوکھے سوکھے بے رونق چہرے۔ افوہ! یہ تو میرے چاروں طرف دیواروں کی طرح چن گئے ہیں۔ اب کیا کروں؟ اور یہ نظریں اتنی بہت سی بے کیف آنکھوں سے نکل کر مجھے ہر طرف سے گھور رہی ہیں۔ چھلنی ہوا جاتا ہے سارا جسم۔ کہاں جاؤں؟ ارے؟ اب یہ پتلے پتلے پسیجے ہوئے پنجے۔ اف کتنا ٹپک رہا ہے ان سے۔ اور یہ میری طرف بڑھ کس لیے رہے ہیں؟ اور یہ بے رنگ ہونٹ! کوئی جگہ نہیں بچنے کی۔ اب بڑھے یہ ہاتھ اور مجھے دبوچا' اب بڑھے یہ ہونٹ اور میرے جسم پر چپکے۔ مارے خوف کے میں تڑپی تو آنکھ کھل گئی۔

ٹک ٹک ٹک...... کلاک کا پنڈولم اس گت پر جھومے جا رہا تھا۔ ''افوہ! تو ایک بج گیا ہے رات کا۔'' میں نے سوچا۔ ''ممانی بھی سو رہی ہیں اور بھائی جان بھی۔ پھر روشنی کیوں کر رکھی ہے اب تک۔ کتنی خاموش اور سرد رات ہے اور میری طبیعت بھی تو خراب ہے۔ جانے کیا ہو گیا تھا شام کو؟'' میں نے اپنا دھمکتا ہوا بھاری سر تکیئے پر رگڑا۔ مارے نقاہت کے جسم لوتھ ہو رہا تھا۔

''سی سی'' میں نے چونک کر اپنے سرہانے نظر پھیری تو دیکھ میرا شال اوڑھے کرسی پر وہ اکڑوں بیٹھی سسیا رہی ہے۔ سردی سے اس کے ہونٹ کپکپا کپکپا کر نیلے پڑ گئے تھے۔

''تم اس وقت یہاں؟''

''ہاں'' وہ مجھ پر جھک کر بولی۔

اور جیسے مجھے گولی لگ گئی۔

◆◆◆

راکھ

''یہ دیکھو شاداں!'' رقیہ نے سگریٹ کا ڈبہ جیسے میرے منہ میں اڑا دیا۔

''اری! یہ کہاں سے لے آئی تو؟'' میں کھل اٹھی۔ سگریٹ! اور ایسے موقع پر جبکہ چار پانچ ہم عمر اور ہم مذاق لڑکیاں اکٹھی ہوں۔ بڑا مزا دیتی ہے اور وہ بھی چوروں کی طرح چھپ چھپ کر پینے میں۔ کمرہ بند کیا اور مزے سے بھک بھک دھواں اڑا دیا۔

''چوری کی ہے۔'' وہ پکے چوروں کی سی بے فکری سے بولی۔ ''تمہارے بھائی جان باہر کے کمرے میں پڑے سو رہے تھے۔ اینجانب کا گزر ادھر سے ہوا۔ موقع دیکھ کر ہاتھ صاف کر دیا۔ کہو کچھ اعتراض ہے؟''

''اچھا ادھر تلاشی تو دو۔ کہیں میرے بھائی جان کی کوئی اور چیز تو نہیں اڑا لائیں۔'' میں نے شرارتاً اس کے ننھے ننھے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیے۔

''مثلاً دل وغیرہ'' ثریا نے دور ہی سے شوشہ لگایا اور رقیہ نے اپنے ہاتھ چھڑا کر اس کی پیٹھ پر گھم سے ایک گھونسا جڑ دیا اور پھر اپنا چہرہ اپنے سینے کی طرف جھکا کر اور آنکھیں چڑھا کر بڑی سنجیدگی سے کہنے لگی۔

''کم بختو! اگر کوئی چوری کا اقبال کرے تو سمجھو وہ ہمارے اخلاق کی بنیاد سے بھی واقف نہیں۔ اگر تم یہ سگریٹیں یہاں سب کے سامنے بیٹھ کر پینے لگو تو جانتی ہو کیا ہو گا؟ حالانکہ تقریباً سبھی جانتے ہیں کہ ہماری شیطان چوکڑی سگریٹ پیتی ہے۔''

''کیا ہو گا بھلا؟'' شمسہ نے پوچھا۔

''تم سب کی سب ہمیشہ کے لیے کنواری رہ جاؤ گی۔ یہ اتنی بہت سی عورتیں جنہوں نے برسوں سے تم لوگوں کی اماؤں کو اپنے بھائیوں اور بیٹوں کے پیغام دے رکھے ہیں۔ فوراً ہی تو دو دو گالیاں پکڑا کر واپس لے لیں گی۔ یقین نہ ہو تو آزما کر دیکھ لو۔ میرے جگر کی ''ٹکڑیوں'' (اس کے نزدیک لڑکیاں ٹکڑی اور لڑکے ٹکڑے ہوتے ہیں) دراصل ہم سب چور ہیں چور۔ ہمیں ہمارا اخلاق چوری کی تعلیم دیتا ہے۔ میں اپنی مثال ہی دیتی ہوں کہ میں روز رات کو عزیز صاحب کو خط لکھا کرتی ہوں۔ امی جانتی ہیں لیکن روز پوچھتی ہیں کہ کیا لکھ رہی ہو؟ جانتی ہو میں کیا جواب دیتی ہوں۔'' رقیہ کی سنجیدگی گہری ہو گئی۔

''کیا جواب دیتی ہو؟'' ہم نے یک زبان ہو کر اشتیاق سے پوچھا۔ تو اس نے پہلے تو اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبایا اور پھر زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگی۔

''دینیات پر نوٹ تیار کر رہی ہوں۔'' اور ہم سب بے تحاشہ ہنس پڑیں۔

''اور بھی تو سنو! امی یہ جواب سن کر قطعی مطمئن ہو جاتی۔ حالانکہ صبح وہی ''نوٹ'' اس لفافے میں بند میرے سرہانے رکھے رہتے ہیں۔ جس پر عزیز صاحب کا پتہ لکھا ہوتا ہے لیکن امی ہر روز صبح مجھے بڑے پیار سے جگاتی ہیں اور میں جاگنے کے بعد گویا ان کی نظر بچا کر اس لفافے کو تکیے کے نیچے چھپا لیتی ہوں۔''

''ہو پکی بدمعاش'' میں نے پیار سے کچکچا کر کہا۔

''دیکھا سنی نا گالی... کہہ جو دی عزیز صاحب والی بات۔'' رقیہ نے منہ بنا کر کہا اور ہم سب اپنے پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے ہنس دیئے۔ بالکل کھوکھلی سی ہنسی۔ موضوع کے اچانک تلخ ہو جانے سے ہم سب کے چہرے کچھ اتر سے گئے تھے۔ اور سگرٹیں پینے کا خیال بھی ذہن سے نکل گیا تھا۔ لیکن رقیہ نے سگریٹ کے ڈبے کو چوم کر بہت جلد ہمیں بشاش کر دیا۔ اب مسئلہ یہ زیر غور تھا کہ آخران سگریٹوں کو کہاں چھپ کر اڑایا جائے۔ چونکہ تقریب کا موقع تھا اور گھر میں مہمان بھرے ہوئے تھے۔ اگر کسی کی نظر پڑھ جاتی تو خاصی تھڑی تھڑی ہوتی اور پھر میرے خاندان کی عورتیں تو ویسے بھی میری تاک میں رہتیں کہ کب اس کم بخت شاداں کی کوئی معمولی سی بات پکڑیں اور پھر نمک مرچ لگا کر دنیا کے ذہنی چٹخارے کے لیے پیش کریں۔ جانے کیوں میں خصوصیت سے سب کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکتی' میرا گناہ کہو تو بس اتنا تھا کہ جو کچھ دیکھتی' سنتی اور سمجھتی اسے نظموں کی صورت میں ڈھال دیتی یا پھر چھپ چھپ کر سگریٹ پیتی۔ اور آگے آیت تھی۔

اب ہم نے ایک ایک کر کے تمام کمرے جھانکنا شروع کئے۔ ہر جگہ رنگ برنگے لہراتے ہوئے آنچل۔ میری روح کانپتی ان ہلکے پھلکے آنچلوں کے ہلکے پن سے۔

''اُئے یہ کمرہ خالی ہے۔'' میں نے خوشی سے چلا کر کہا۔

''اندھی ہوئی ہو؟ وہ دیکھو اس صوفے میں کون دفن ہے؟'' رقیہ نے مجھے کمرے میں دھکا دے دیا اور میں دبے پاؤں بڑھی۔

''اوں' اونہہ! آ بھی جاؤ چپکے چپکے۔ آپا پڑی سو رہی ہیں۔ سب سے الگ تھلگ۔''

وہ سب کی سب دبے پاؤں بالکل بلیوں کی طرح کمرے میں آ کر کرسیوں پر رنگ برنگے گلدستوں کی طرح سج گئیں۔

''اب سگریٹ جلا لاؤ۔'' ثریا نے گھس سے میرے کان میں اپنی گرم گرم سانس اگل دی۔

''اپاہجو! اپنا اپنا کام خود کرو۔ میں تو اپنی سگریٹ جلائے لاتی ہوں۔''

میں ایک سگریٹ لے کر بھاگی کہ اکیلے اکیلے پیوں۔ کسی ایک کو بھی نہ جلانے دوں گی اپنی سگریٹ سے' خوب پیوں گی۔''

''اری ثواب کما لے بدبخت۔'' شمسہ آواز دبا کر پھنکاری۔

میں باورچی خانے میں گھس گئی۔ کلوا اپنے سامنے جھوٹے برتنوں کا ڈھیر لگائے قسم قسم کے کھانوں کا مزا چکھ رہا تھا۔

''ارے کلو ذرا دیا سلائی تو دے دے۔'' مجھے سگریٹ کی طلب بری طرح ہو رہی تھی۔

''وہ رکھی ہے طاق پر بیٹا'' اس نے ایک پلیٹ چاٹ کر جھک کر دینے کے بعد دوسری اپنے آگے سرکاتے ہوئے کہا۔ ''کیا فائدہ اناج نالی میں پھینکنے سے۔'' میں نے کہا ''میں ہی سوارت کر لوں۔'' اور مجھے ہنسی آ گئی اس عذر پر لیکن جب طاق سے دیا سلائی کی ڈبیا اٹھائی تو غصہ آ گیا۔

''یعنی یہ خالی خولی ڈبیہ سجا رکھی ہے طاق پر؟'' جی چاہا کہ اس کے گھٹے ہوئے سر پر بے شمار چپتیں لگاؤں۔ ''چولہے میں دیکھ آگ ہے؟''

''نہیں ہے بیٹا' کھانا پکنے کے بعد میں نے سب انگارے بجھا دیئے تھے۔''

''ارے دیکھ تو سہی۔'' مجھے ضد ہو گئی۔

وہ بڑبڑاتا اٹھا۔

''راکھ ہی راکھ ہے اس میں آگ کہاں؟ اے لیجئے۔'' اس نے جھپ سے اپنا کالا کرچھے جیسا ہاتھ راکھ میں گھسیڑ دیا اور پھر جو اچانک چنگھاڑ کر پیچھے ہٹا تو اس کے دھکے سے میں دیوار سے جا لڑی۔

''الو' گدھا'' میں نے غصے میں اس کے لیے نئے نئے انکشاف شروع کر دیئے۔

''ہاتھ بھلبھلا کر رہ گیا بیٹا'' وہ اپنا راکھ میں اٹا ہوا ہاتھ پانی میں ڈال کر بین کرنے لگا۔

''پھر تو کہہ پگلے!'' میں نے اسے چڑایا۔ ''راکھ ہی راکھ ہے اس میں آگ کہاں۔ اور جب ہاتھ جھلسا تو روتا ہے۔'' اور میں بے تحاشہ ہنسنے لگی۔

راکھ کے سینے پر ایک ننھی سی چنگاری نے دم توڑتے ہوئے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا اور میں نے سگریٹ کا سرا اس پر رکھ دیا پھر جو

دیکھا تو مرتی ہوئی چنگاری نے اپنی روح میری سگریٹ میں منتقل کر چکی تھی۔ میں جلتی ہوئی سگریٹ کو دوپٹے میں چھپا کر اس کمرے میں پہنچ گئی۔ جہاں سب وہ میری منتظر تھیں۔

''ذرا دروازہ بھی بند کر لو میری جان۔'' شمسہ نے بیٹھے ہی بیٹھے حکم لگایا۔

''جی' اب ہم سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ ہم اس وقت بڑا کام کر کے آئے ہیں۔'' میں ایک صوفے پر گری۔ اچھلی اور پھر اسی میں سما کر رہ گئی۔

''ذرا معلوم تو ہو کہ ہماری شاعرہ یعنی فاختہ ہند کون سا تیر اپنے کلیجے میں چھپا کر لائی ہیں؟'' ثریا نے میری سگریٹ سے اپنی سگریٹ جلا چکنے کے بعد پوچھا۔

''ہم اس وقت یہ تجربہ کر کے آئے ہیں کہ راکھ ہمیشہ ٹھنڈی ہی نہیں ہوا کرتی بلکہ وہ رقیہ کی اخلاق والی بات۔ ارے وہی کہ چھپا چھپا کر۔'' میری سانس پھول رہی تھی اور اس پر سگریٹ کا ہلکا ہلکا چکر' جانے کیا آئیں بائیں شائیں کہنے لگی۔

''واہ ری تیری دریافت۔'' رقیہ نے آنکھیں مٹکا کر کہا تو بطور داد پڑا ایک زوردار قہقہہ۔ بس میری جان نکل ہی تو گئی کیونکہ آپا سوتے سے چونک پڑی تھیں۔

''اور! تم لوگ؟ اچھا' سب کی سب ریل کا انجن بنی ہوئی ہو۔'' انہوں نے اپنے مخصوص پھیکے لہجے میں کہا اور پھر جلدی سے اپنا دوپٹہ سلیقے سے اوڑھتے ہوئے سب کے کندھوں یا گلوں میں لپٹے ہوئے دوپٹوں کو کڑی نظر سے دیکھا گویا یہ ہماری بے حیائی پر چوٹ تھی۔ اونہہ! کوئی کہاں تک دوپٹے لپیٹے رہے ہر وقت۔ سب لڑکیاں ہی لڑکیاں تو ہیں۔ میں نے اپنی تسلی کر لی۔ مگر آپا نے بدمزگی پیدا کرنے کی قسم کھالی تھی۔

''یہ کیا مردانی لت لگا رکھی ہے تم لوگوں نے۔'' یہ ہماری سگریٹ نوشی پر اعتراض تھا اور اب مجھے آئی جھنجھلاہٹ۔

''تو کیا آپا! زنانی لتیں کچھ مخصوص ہوا کرتی ہیں؟ ایں'' میں بھی کہاں تک ضبط کرتی۔ ''منٹ منٹ پر اماں جو پان کھاتی ہیں' مٹھی بھر بھر تمبا کو جو خالہ جان پھانکتی ہیں اور آپ جو کیتلی بھر بھر چائے چڑھا جاتی ہیں تو شاید یہی سوچ کر کہ مردان چیزوں کو چھونا اپنا مردانگی کی توہین سمجھتے ہوں گے' کیوں؟''

منہ بنا کر بولیں۔ ''سگریٹ تو نہیں پیتے ہم۔''

ان کی اس نامعقول سی بات پر ثریا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اب تو آپا کو تر کھا ہی لگ گیا اور وہ کمرے سے نکل گئیں۔ ہم سب کے

منہ لٹک گئے اور سگریٹ کا دھواں نیم جیسا کڑوا لگنے لگا۔ توبہ ہے بس۔ میں نے سوچا۔ اس گھر میں ذرا دیر بھی خوش نہیں رہ سکتے۔ لاکھوں بار میرے سگریٹ پینے پر اعتراض کر چکی تھیں۔ اگر اس وقت ان سب کے سامنے چپ رہتیں تو کون سا گناہ ہو جاتا۔ مگر وہ تو بس نہ جانے کہاں رہتی ہیں۔ سب کا ہنسنا بولنا انہیں زہر لگتا زہر۔

''ذہنی طور پر تمہاری آپا بالکل بڈھی ہو گئی ہیں۔'' رقیہ نے منجھے ہوئے سگریٹ بازوں کی طرح گل جھاڑتے ہوئے جلے پر نمک چھڑکا۔

''جی یہ تو پیدا ہی بڈھی ہوئی تھیں۔'' سب ہنس دیئے اور مجھے شمسہ اور ثریا کی آپائیں یاد آ گئیں کہ ان کے پاس بیٹھو تو اٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ ایک یہ ہیں ہماری آپا۔ دوپٹے کے کفن میں لپٹا لپٹایا مردہ۔ ابھی بائیس سال کی عمر میں کھوسٹ پن کا یہ عالم ہے تو جب واقعی کھوسٹ ہوں گی تو کیا ہوں گی؟

میں بہت اداس ہو گئی۔ جی چاہ رہا تھا کہ آج آپا سے خوب کس کے لڑائی کر لوں۔

''اوہو کیا پیاری نظم ہوئی ہے۔'' میں نے اپنی نظم مکمل کر کے فیصلہ کیا اور پھر جو اتراہٹ سوار ہوئی تو جی چاہا کہ کسی کو سنائی جائے۔ سامنے ہی آپا پلنگ پر لیٹی ہوئی کتاب پڑھ رہی تھیں۔ جی میں آئی کہ انہی کو سنا دوں مگر نہیں بابا۔ مجھے فوراً ہی اپنی ایک نظم کی گت بننا یاد آ گئی۔ جبکہ انہوں نے اسے سن کر کہا تھا کہ ''کیوں ری! یہ تجھے چھچھورپن کی باتیں کس نے بتائیں؟'' اور مجھے اس دن اپنے غلط ماحول میں پیدا ہونے کا شدید احساس ہوا تھا۔ بات یہ تھی کہ اماں تو تجربے کی قائل رہیں سدا۔ وہ کہتیں کہ جب تک انسان پر کوئی بات پڑے نہ وہ سمجھ ہی نہیں سکتا۔ اس حساب سے بیچاری عقل اور تخیل تو دھتکار کر نکال دینے کی چیزیں ٹھہریں۔ لو اس بات پر مجھے ایک کہانی یاد آ گئی۔

سنتے ہیں کہ کسی زمانے میں ہندوستان میں ایک راجہ تھا۔ بڑا ہی عالم و فاضل' بہترین شاعر۔ اس کی تھی ایک بیٹی۔ راجہ چاہتا تھا کہ اس کی بیٹی بھی اس جیسی عالم و فاضل نکلے۔ اس لیے اس نے اپنی بیٹی کو تعلیم دینے پر ایک بہت ہی قابل پنڈت کو مقرر کیا۔ خیر صاحب! راجکماری تھی ویسے ہی ذہین چند سال میں اچھے اچھے عالموں کے کان کترنے لگی۔ طبیعت پائی تھی شاعرانہ' علم نے سونے پر سہاگہ کیا۔ بس بڑی گہری گہری نظمیں کہنے لگی۔ اتفاق کی بات کہ اس کی ایک نظم پر راجہ کی نظر پڑ گئی۔ وہ نظم تھی' ذرا جذبات محبت میں رچی بسی اور تو اور آغوش محبوب کی پرکیف واردات بھی مزے میں بیان ہو گئی تھی۔ نظم دیکھ کر راجہ کا خون کھول گیا (شاید چھتری خون ہو گا) کہ افوہ میری کنواری بالی لونڈیا کو پنڈت نے نہ جانے کیسی تعلیم دی کہ وہ ان سب باتوں میں پکی ہو گئی۔ بس اسی وقت پنڈت

بیچارے پر یہی الزام دھر کر دیس نکالا کا حکم دے دیا۔ لیکن پنڈت نے کہا کہ اے راجہ میں چاہتا ہوں کہ جانے سے پہلے سر دربار تیری ایک نظم سن لوں۔ راجہ تھا علم دوست اور شاعر ہونے کی حیثیت سے اس کمزوری کا بھی وارث تھا' جو عموماً شعراء میں داد طلبی کی ہوتی ہے۔ بات نہ ٹالی۔ دوسرے دن دربار میں اپنی نظم سنانا شروع کی۔ اس میں کسی غریب کی جھونپڑی کا نقشہ کھینچا گیا تھا اور وہ بھی استعاروں میں۔ مثلاً مکڑی نے چولہے پر جالا تن دیا تھا اور زمین پر چھلنی کے سوراخوں جیسے چھید ہو گئے تھے۔ ابھی نظم ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ پنڈت اپنی چوٹی نوچ کر چلایا۔ ''ارے لوگو! یہ راجہ نہیں' شودر ہے شودر! اسے نکالو یہاں سے۔'' یہ سن کر سب حیران رہ گئے۔ لیکن راجہ نے اپنا غصہ ضبط کر کے چقندر بنتے ہوئے کہا کہ اس کا ثبوت پیش کرو۔ کہنے لگا کہ تو خود کو پشت در پشت کا راجہ کہتا ہے اور عمر تیری محلوں میں گزری تو تجھے کیسے معلوم ہو گیا کہ آگ نہ جلے تو چولہے پر مکڑی جالا تن سکتی ہے؟ کیا کبھی تیرے باورچی خانے میں یہ کیفیت پیدا ہوئی ہے اور تو نے دیکھنے کی زحمت کی ہے؟ اگر نہیں تو پھر تو راجہ بننے سے پہلے شودر تھا۔

راجہ نے کڑک کر جواب دیا۔ ''بیوقوف پنڈت عقل بھی کوئی چیز ہے؟''

تو پنڈت نے اپنی چوٹی میں گرہ دے کر کہا کہ تو سمجھتا ہے عقل صرف تیرے حصے میں آئی ہے۔ تیری بیٹی کے نہیں؟

چلو راجہ کا چقندر جیسا منہ کھاری شلغم میں تبدیل ہو گیا۔

ارے تو یہ بات کہاں سے کہاں تک پہنچ گئی۔ اس سوچ بچار کا برا ہو کہ آدمی نکما ہو کر رہ جاتا ہے۔ چاہتی تھی کہ نظم کسی کو سناؤں اور پڑ گئی کہانی دہرانے میں۔

''تو پھر کسے سنانا چاہیے؟'' میں نے دوبارہ سوچا۔ ''بھائی جان تو شکاری آدمی ہیں اور اس نظم میں شکار کا کوئی ذکر نہیں' اس لیے وہ سن کر کیا کریں گے؟ خالہ سو رہی ہیں تو پھر آپا' بس وہی اس وقت غنیمت ہیں۔''

''آپا!'' میں نے پکارا تو انہوں نے اپنا بجھا سا چہرہ آہستہ سے میری طرف موڑا اور میری نبضیں جو مارے جوش کے پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ کچھ اونگھ گئیں۔ اللہ کرے یہ منحوس سنجیدگی اڑ جائے دنیا سے۔'' میں نے کلپ کر دعا مانگی۔

''کہو' ان کے ہونٹ ننھے سے سوراخ کی طرح وا ہوئے اور پھر چپک گئے۔

''ایک نظم کہی ہے۔'' میں نے ہمک کر کہا۔

''اچھا'' کتنی بجھی ہوئی ''اچھا'' تھی۔ میرا جی جل گیا۔

''اختر کے لیے لکھی ہو گی؟'' انہوں نے پوچھا اور میرے مرچیں لگ گئیں۔ لاحول ولا..... یہ بھی عجیب حماقت ہے کہ نظم لکھی

جائے تو کسی مخصوص ہستی کے لیے۔ میں کہتی ہوں کہ آپا نے اس وقت تو سارا پڑھا لکھا ڈبو دیا ہے اور کوئی بات نہیں' دراصل یہ ہر وقت مجھے تپانے پر تلی رہتی ہیں۔ اور وہ اختر! ہونہہ! بالکل فضول سا آدمی۔ چارلی چپلن کی فلمیں نہ دیکھو اسے دیکھ لو۔ ابھی چند روز پہلے کی تو بات تھی کہ اس نے ابا سے میرے لیے منہ بسور بسور کر کچھ کہا تھا مگر وہ تو کہو کہ ابا سنجیدہ سے آدمی ہیں۔ اس لیے وہ ہنسی کا روگ نہ پالا۔ ورنہ میری تو گزر نہ ہوتی۔ زہر کھا لیتی۔ خدا کی قسم اس کی مونچھوں سے تو مجھے گھن آتی۔ لیکن یہ آپا مجھے اپنے دل میں سمجھتی کیا ہیں آخر' جو میں اختر ایسوں پر جان دیتی پھروں؟ جی چاہا کہ اس بات پر کس کے لڑلوں ان سے۔ جب دیکھو جب ایسی ہی باتیں کیا کرتی ہیں۔ ایک گھر میں رہتی ہیں تو بولنا چالنا پڑتا ہے۔ ورنہ میں تو ان کو مع ان کی زہریلی سنجیدگی کے جانے کب کا چھوڑ بیٹھتی۔

''دوپٹہ اوڑھے ٹھیک سے۔'' اور میں غصے میں بھری چل دی۔ وہ میرے طنز کو سمجھ کر پھیکی سی ہنسی ہنسیں۔

''نظم نہیں سناؤ گی؟'' ان کی آواز نے میرا تعاقب کیا۔

''جب توبۃ النصوح قسم کی چیزیں نظم کروں گی تو دیکھا جائے گا۔'' میں نے حقارت سے ان کی آواز کو دھتکار دیا۔

اس روز میں بڑی دیر تک سوچتی رہی کہ آخر آپا کا بنے گا کیا؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ جیتی کیونکر ہیں؟ جبکہ انہیں دنیا کی کسی چیز سے دلچسپی ہی نہیں۔ بجز فضول فضول نصیحتیں فرمانے کے۔ سینما جانے سے یہ اکتاتی ہیں۔ محفلوں میں ان کا دل گھبراتا ہے۔ سہیلیاں ان کی صرف دو ہیں جو مہینوں میں گھنٹے دو گھنٹے کے واسطے کسی نامعقول سے موضوع پر بحث کرنے آ جاتی ہیں۔ مثلاً آج کل کی لڑکیوں کے دوپٹوں کی باریکی اور مردوں کی نگاہوں کا ہٹی پن۔ ایسے منہ بنا بنا کر یہ تذکرے ہوں گے جیسے گھونٹ گھونٹ کونین مکسچر پی رہی ہوں۔ اور مرد تو جیسے ان کے خیال میں ڈھنگ سے داخل ہونے کی چیز ہی نہیں۔ خدا کی بندی کو کبھی میں نے کسی اچھے سے اچھے مرد کو اچھا کہتے سنا ہی نہیں۔ بس ان کے دماغ میں ''زبان خلق'' کے خوف نے وہ جگہ حاصل کر لی تھی۔ جس کے بعد کچھ بھی نہیں رہ جاتا انسان میں۔ بجز ''نقارہ خدا'' کے۔

ضیاء... ضیاء... ہر طرف ضیاء...... میں اپنی ساری چوکڑی بھول گئی۔ وہ پہلی مرتبہ ہی مجھے بہت اچھے لگے۔ انہیں دیکھتی کہ بس دیکھتی ہی رہ جاتی اور کبھی کبھی تو جی چاہنے لگتا کہ ان کے بازوؤں میں منہ چھپا کر ہر طرف سے بے خبر ہو جاؤں اپنے آپ سے بھی۔ عجیب عجیب سے جذبات کھولنے لگے میرے دل میں۔ بس جیسے ضیاء نے تو مجھے بالکل ہی چوندھیا دیا تھا۔ وہ میرے پڑوس میں آ کر کیا رہے' بس مجھی میں سما گئے۔ ضیاء' اچھے ضیاء.... سبھی تاڑ گئے۔ اماں ابا میری شادی کی فکر سے بے فکر ہو گئے۔ خاندان والیوں کے پیٹ میں چوہے کودنے لگے کہ دیکھ لینا کم بخت پھانس لے گی بیچارے ضیاء کو۔ اور پھر کیا تھا۔ ایسے ایسے فی البدیہہ رومان اڑنے

لگے کہ مجھے حسرت ہونے لگی ان میں اپنی اور ضیاء کی طرف سے اصلیت کا رنگ بھرنے کی۔ سہیلیاں بھی مجھے چھیڑتیں کہ ''کیوں ری یہ کیا گن کر رہی ہے؟ تو تو کہتی تھی کہ ہمیں کسی سے عشق وشق نہیں ہوگا۔ اب یہ کدھر کی مار پڑی؟'' پر آپا کی سنجیدگی اور نصیحتیں کچھ زیادہ چمک گئیں ان دنوں۔

''آپا پیاری'' ان دنوں مجھے ان پر صرف اس لیے رحم آمیز محبت آنے لگی تھی کہ میرے بیاہ جانے کے بعد ان کی سنجیدگی غریب بیوہ ہو جائے گی کیونکہ پھر یہ نصیحتیں کسے کیا کریں گی؟

وہ بستر پر چت پڑی تھیں۔ میں ان پر جھک گئی اور سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر دھوئیں کا گھرا بادل ان کے چہرے پر پھیلا دیا اور وہ کپکپا کر سمٹ گئیں۔

''اوں ہونہہ' بھئی'' انہوں نے ہاتھ سے دھواں اڑاتے ہوئے کہا۔ ''بالکل مرد معلوم ہوتی ہو یوں'' وہ مسکرائیں۔ اور ان کی بے کیف آنکھوں میں چنگاریاں سی تیرنے لگیں۔

افوہ تو گویا اب اس مردے نے بھی سانس لینا شروع کر دی۔ میں نے سوچا اور اس تقریب میں کہہ ڈالا۔ جی چاہتا ہے کہ اب آپ کی شادی رچا ڈالیں۔

''بکومت'' ان کے چہرے کی شفاف جلد کے نیچے جیسے ایک دم سرمئی راکھ کی کئی تہیں بچھ گئیں اور مجھے ایسا لگا کہ ان کی آنکھوں میں تیرتی ہوئی چنگاریاں راکھ اگل کر مر گئیں۔ بس اس وقت میرا ایمان ہو گیا کہ آپا اس دنیا کی چیز نہیں ہیں۔

''تو پھر اٹھیے سینما کا وقت ہو گیا ہے۔ سب تیار بیٹھے ہیں۔ اٹھیے!'' میں نے انہیں بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

''بھئی تم جانتی ہو کہ مجھے فلم دیکھنے سے ذرا بھی دلچسپی نہیں' وہی عشق و محبت کی بیہودہ داستانیں۔'' چھی... ان کا چہرہ حسب دستور پھیکا ہو گیا۔

''تو پھر میں بھی نہ جاؤں گی۔'' میں نے واقعی رنجیدہ ہو کر منہ پھلا لیا۔

''جاؤ بھی... کہہ تو رہی ہوں۔ اور آج عزیزہ ملنے آ رہی ہے مجھ سے۔'' انہوں نے کچھ اتنی بے رخی برتی کہ مجھے اپنے اصرار پر تاؤ آ گیا اور میں کھسیا کر سب کے ساتھ سینما چلی گئی۔

لیکن وہاں جی نہ لگا۔ کچھ تو یہ خیال کہ میں بھی کتنی بری ہوں جو انہیں تنہا چھوڑ آئی۔ میرا ان کا ساتھ کب تک؟ اگر آج ان کی خاطر نہ آتی تو کیا حرج تھا؟ رہی ان کی بے رخی تو یہ ان کی ہمیشہ کی عادت ہے۔ دوسرے فلم بھی بالکل غیر دلچسپ تھی۔ وقفے تک وہاں

بیٹھ کر معلوم ہوا کہ میں اپنے آپ پر سخت ظلم کر رہی ہوں۔

''اماں میں تو گھر جا رہی ہوں' آپا اکیلی گھبرا رہی ہوں گی۔'' میں نے ان سے چپکے سے کہا۔

''اے چلو آنے لگی آپا کی مامتا' ہر وقت تو لڑا کرتی ہے اس سے۔'' میں ان کا لیکچر سنے بغیر ہال سے نکل آئی۔

آپا اس وقت مجھے دیکھ کر یقیناً دل میں خوش ہوں گی۔ منہ سے تو نہ کہیں گی۔ کیونکہ ان کے خیال سے یوں انسان ہلکا ہو جاتا ہے۔ لیکن میری محبت کا یقین ضرور کریں گی کہ دیکھو میری تنہائی کے خیال سے فلم چھوڑ کر چلی آئی۔ میں سوچتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی۔

''ان کی عزیزہ سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔'' آپا کے کمرے میں روشنی دیکھ کر خیال آیا۔

''چلو اس وقت ڈرا دوں دونوں کو۔ دونوں بیٹھی ہوں گی فلسفیوں کی طرح'' سوجھی مجھے دور کی تھی۔ میں نے صورت حال دیکھنے کے لیے ایڑیاں اچکا کر شیشے سے اندر جھانکا۔

''آپا!'' آپا کسی مرد کو جس کی پشت میری طرف تھی' اپنی لمبی لمبی بانہوں میں لپیٹے ہوئے تھیں۔

''میں تمہارے بغیر کیسے جیوں گی؟ بتاؤ!'' وہ بار بار کہہ رہی تھیں اور ان کی پھٹی پھٹی آنکھیں جانے کیسی ہوئی جا رہی تھیں۔ جیسے وہ خود مرنے کے بجائے اپنے پیارے کو کھا جانے کی سوچ رہی ہوں۔ ان کی آنکھیں تو کچھ یہی کہہ رہی تھیں۔ میرے جسم میں مارے حیرت کے ایک لہر سی دوڑ گئی اور دانتوں تلے جیسے ریت آ گئی۔ میں اپنا توازن نہ سنبھال سکی اور میری سینڈل کی پتلی پتلی ایڑیاں فرش پر چیخ گئیں۔ میں دم سادھے زینے کے قریب اندھیرے میں کھسک گئی۔ اور میں نے اپنی کپکپی کو محسوس کرتے ہوئے سوچا۔ آپا راکھ نہیں بھوبل ہیں۔

کمرے کا دروازہ کھلا تو روشنی برآمدے سے لے کر آنگن تک ایک جگمگاتی ہوئی سڑک کی طرح بچھ گئی اور پھر میں نے زینے کے پاس سمٹ کر اپنی جلتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا کہ آپا کے پیارے میرے ضیاء ہیں۔

اچانک جیسے زوردار آندھی اٹھی اور چمکتی ہوئی چنگاریوں سے سجی ہوئی بھوبل مجھ پر اوندھا گئی۔

باورچی خانے میں کلو نہ جانے کس بات پر اپنی بھیانک آواز میں ہنسا اور میں اپنا سر پکڑ کر رونے سی لگی۔

◆◆◆

چراغ کی لو

شام کی بڑھتی ہوئی اداس تاریکی میں سامنے کی ہر چیز آہستہ آہستہ دھندلی پڑتی جارہی تھی۔ اس نے نظر پھرا پھرا کر لکھوری اینٹوں سے بنی ہوئی بغیر پلستر کی دیواروں کو دیکھنا شروع کیا جو اندھیرے میں ڈوب کر بھیانک ہوتی چلی جارہی تھیں' جیسے وہ سیاہ رنگ میں نہا گئی ہوں۔ اندھیرا اور تنہائی اس کا جی الٹنے لگا تو کھانستی ہوئی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اسے اپنے باپ کا انتظار تھا جو کام پر سے آ کر جانے کہاں چلتا بنا تھا۔

''نہ جانے کہاں بیٹھ رہے ابا؟ یہ خیال نہیں آتا کہ اکیلے گھر میں جی گھبراتا ہوگا میرا۔'' وہ جھنجلاہٹ میں رہ رہ کر بس یہی سوچ رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ زور زور سے رونے لگیں۔ لیکن آنسوؤں کا ذخیرہ جیسے حلق میں اٹک کر رہ گیا تھا۔ اس سے رویا بھی نہ گیا۔

اس نے دوبارہ الجھ کر ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا تو ہر طرف بس یوں نظر آنے لگا جیسے نئے سفید کپڑوں میں لپٹے ہوئے ڈھانچے سامنے کی اندھیری کوٹھڑی سے نکل کر سارے گھر میں گھوم پھر رہے ہیں۔ اس کے ذہن پر ان ڈھانچوں کی ہڈیوں کی چیخ اور نئے سفید کپڑوں کی مدھم کھڑکھڑاہٹ اس طرح چھا گئی کہ وہ آنکھیں میچ کر دوبارہ چارپائی پر لڑھک گئی۔ بالکل بے حس و حرکت' جیسے اس کا دم ہی نکل گیا ہو۔ سفید کپڑوں میں لپٹے ہوئے ڈھانچوں کی ہڈیوں کی چیخ اور کپڑوں کی کھڑکھڑاہٹ۔ یہ تو بس اس کا وہم ہی وہم تھا۔ کچھ دنوں سے جسم کے ساتھ ساتھ اس کا دماغ بھی بہت کمزور ہو گیا تھا۔ رات تو خیر رات ہی تھی۔ وہ دن دوپہر بھی اکثر یہی وہم کرتی۔ بس جدھر بھی نظر جما کر دیکھتی یہی لگتا کہ کوئی سفید سفید کپڑوں میں لپٹا چلا آ رہا ہے۔ بالکل اسی وضع کے کپڑے جو اس کی ماں کو مرنے کے بعد پہنائے گئے تھے۔

دروازہ مانوس طریقے سے چرمرایا اور پھر کھٹ سے بند ہو گیا اور اس نے کپکپا کر آنکھیں کھول دیں۔ جب کچھ نظر نہ پڑا تو مری ہوئی آواز میں بولی۔ ''کون ہے؟''

''میں ہوں اچھن'' یہ اس کے باپ کی آواز تھی۔

''کہاں تھے ابا؟ میرا دل اکیلے میں گھبرا رہا تھا۔'' اس نے شکایت کی تو جیسے اس کے حلق میں آنسوؤں کا ذخیرہ دوبارہ پھنس گیا اور آنکھیں تپنے لگیں۔

''ذرا کام سے گیا تھا۔ چراغ نہیں جلایا؟'' باپ نے چارپائی کے پائے سے ٹھوکر کھائی تو جھلا کر پوچھا اور پھر اپنی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''دیا سلائی نہیں تھی۔''

''یہ لو دیا سلائی۔'' باپ نے جیب سے دیا سلائی نکال کر ایک بیڑی سلگائی تو دیا سلائی کی روشنی میں اس کا چہرہ بڑا وحشت زدہ سا نظر آیا۔ الجھی ہوئی کھچڑی داڑھی ہونٹوں پر اوندھی ہوئی مونچھیں' لکیروں سے پٹی ہوئی پیشانی اور ابلی ہوئی آنکھیں۔ تیل جل کر ایک ننھی سی سرخ کمان کی طرح خم کھا گئی اور چرمراتی ہوئی بیڑی کا دھواں چھوٹے سے آنگن میں پھیل گیا۔

''اوں ہوں۔'' وہ کانکھتی ہوئی پٹی پر زور دے کر اٹھ بیٹھی۔ بیڑی کے دھوئیں سے اس کا جی متلا رہا تھا۔

''کیسا جی ہے اچھن؟'' باپ نے بیڑی کا ایک طویل کش لیا تو ہلکی سی سرخ روشنی میں اس کی ابلی ہوئی آنکھیں چمک گئیں۔

''بیڑی نہ پیو ابا! اس کے دھوئیں سے میرا جی الٹتا ہے۔'' اور وہ اپنے بخار سے بھاری سر کو کندھوں پر جھکا جھکا کر بیزاری سے کانکھنے لگی۔

باپ کو غصہ آ گیا۔ کتنی دیر بعد تو اس نے بیڑی سلگائی تھی۔ جب سے بیڑی کا بنڈل چھ پیسے کا ہو گیا تھا۔ وہ تمام دن اور رات میں صرف چار بیڑیاں پیتا۔ مارے طلب کے جماہیوں پر جماہیاں آتیں۔ لیکن اپنا جی مارتا اور اس وقت بیٹی نے حکم لگا دیا کہ نہ پیو۔

''تیرا جی تو ہر بات میں الٹا کرتا ہے۔ کچھ دماغ چل گیا ہے تیرا؟'' باپ نے آواز میں کہا اور اچھن بغیر کچھ جواب دیئے اٹھی اور دیا سلائی کی ڈبیہ لے کر دالان میں رینگ گئی۔

گھر کی سنسان تاریکی میں دیا سلائی کے رگڑنے کی آواز گونجی اور سیاہ طاق میں رکھے ہوئے چراغ پر مدھم سی لو چمکنے لگی۔ بوسیدہ دالان کے ستون کا سایہ چھوٹے سے آنگن سے گزر کر سامنے کی دیوار تک چڑھ گیا تو اچھن سے دیا سلائی کی ڈبیہ مٹھی میں دبا کر اپنا سر طاق کے برابر ٹیک دیا اور پتلیاں پھرا کر چراغ کی ٹمٹماتی ہوئی لو کو دیکھنے لگی۔

باپ نے بیڑی کا سرا چارپائی کی پٹی پر رگڑ کر بجھا دیا اور اسے دوبارہ پینے کے خیال سے اپنے کان پر جما کر اچھن کی طرف دیکھا تو اسے جیسے دھکا سا لگا۔ اندھیرے میں پناہ ڈھونڈتی ہوئی روشنی میں اس طرح کھڑی ہوئی بڑی بھیانک لگ رہی تھی۔ ہڈیوں پر

منڈھی ہوئی سیاہ کھال' الجھے الجھائے جھونجھ ایسے بال' کھلے ہوئے ہونٹ اور پھری ہوئی بتیاں۔ بس جیسے وہ دیوار سے ٹک کر مر گئی ہو۔

ابھی دوسرا ہی سال تو تھا کہ باپ نے اچھن کی ماں کو بالکل اسی حالت میں بستر پر پڑے دیکھا تھا۔ کھلے ہوئے ہونٹ اور پھری ہوئی پتلیاں۔ یہ دیکھ کر وہ بجائے رونے دھونے کے گزوں نئے کپڑے کے پھیر میں پڑ گیا۔ چیتھڑوں گدڑوں پر پڑا ہوا غریب عورت کا بیجان جسم۔ اسے دنیا کے قانون کے بموجب کفن چاہیے تھا۔ گزوں نیا تھان پر اسے اترا ہوا کپڑا۔ چاہیے وہ زندگی میں ایک عرصے سے چھاٹین کے ایک گھیر گھار والے پاجامے کو ترستی ہی رہی ہو۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟ غریبوں کو امیروں کی برابری کرنے کا بس ایک ہی تو موقع ملتا ہے دنیا میں اور وہ مرنے کے بعد صرف کفن لینے کے بارے میں۔ آہا! اصل بات تو یہ ہے کہ غریب پیدا ہی اس لیے ہوتے ہیں کہ مرنے کے بعد امیروں کی برابری کر لیں۔ تو اچھن کی ماں کے لیے بھی کفن چاہیے تھا اور اس کے لیے اچھن کا باپ انتہائی فکر مند تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اچھن کی ماں زندگی میں ہر ایک کے سامنے لیرے لیرے کپڑوں میں پھرتی تھی تو اس کا یہ مطلب تھوڑی تھا کہ وہ قبر میں بھی یوں ننگی کھلی رکھ دی جاتی؟ وہاں جہاں فرشتے جواب سوال کرنے آتے ہیں۔ بھلا وہ فرشتے کس طرح اس ننگ دھڑنگ عورت کی قبر پر ٹھہر سکتے ہیں۔ بس اسی لیے اس نے جان پہچان والوں کے دروازے کھٹکھٹائے۔ ادھر ادھر بہت دوڑا بیچارہ لیکن کہیں سے بھی اتنے روپے کا انتظام نہ ہو سکا کہ کفن خریدا جا سکتا۔ انتظام ہوتا بھی تو کیسے؟ اس کی جان پہچان والے ہی کون سے دو وقت پیٹ بھر کھانے والوں میں سے تھے؟ آخر وہ سب کی طرف سے مایوس ہو کر اپنے مالک کے پاس گیا جن کی دکان پر وہ دس روپیہ مہینہ کے عوض صبح سے شام تک حساب کتاب لکھا کرتا تھا۔

اس نے اپنی الجھی ہوئی میلی داڑھی کو آنسوؤں سے بھگو کر ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا کہ مالک میرے گھر میں بلا گور و کفن کی لاش پڑی ہے کچھ قرض...... اور مالک نے بات کاٹ کر نرم لہجے میں جواب دیا۔ ''منشی جی! یہ اللہ کے گھر کا کام ہے' قرض نہیں' لو یہ روپے' ادا کرنے کی فکر نہ کرنا۔'' تاجر مالک نے پچیس روپے دکان کے دوسرے مالکوں کو دکھاتے ہوئے اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ اس خیال سے کہ اللہ میاں کے گھر اس کے بدلے ثواب ملے گا۔ اللہ ری تجارت! اس واقعے سے دو روز قبل کی بات تھی کہ اس نے انہیں مالک سے دو روپے اپنی تنخواہ میں پیشگی مانگے تھے تاکہ وہ سسکتی ہوئی اچھن کی ماں کو حکیم صاحب کا لکھا ہوا نسخہ پلا سکے لیکن مالک نے اس بری طرح جھڑک دیا تھا کہ وہ کسی کے زندہ رکھنے کا ٹھیکیدار نہیں اور اب موت کے نام پر اکٹھے پچیس روپے۔ افوہ! وہ غریبوں کو کفن دینے سے کتنے فراخدل تھے اور کتنا اچھا اصول تھا ان کا کہ کفن لے لو' دوا مت لو۔ کیونکہ دوا تو دنیا میں ہی ہضم ہو جاتی ہے اور کفن تو قیامت تک کے لیے فیاضی کی دلیل ہوتا ہے۔

روٹیوں کو ترستی' کپڑے کو بلکتی اور حکیم صاحب کا نسخہ پینے کو سسکتی ہوئی اچھن کی ماں ایک دم پچیس روپے کا کفن پہن کر زمین میں جا چھپی۔

''اور اب... اب اچھن'' باپ کی فکر مند آنکھوں سے اچھن کو تک رہا تھا جو اب تک بالکل بے حس و حرکت دیوار سے سر ٹیکے چراغ کی مدھم لو کو پتلیاں پھرائے تکے جا رہی تھی۔

ماں کے مرنے کے بعد سے اسے بھی نہ جانے کیا ہوتا جا رہا تھا۔ بس گھلتی ہی چلی جا رہی تھی۔ وہی ماں کی سی ٹھسکے دار کھانسی اور ہلکا ہلکا بخار۔ ادھر پڑی ہے ادھر پڑی ہے۔ باپ غریب اس کی حالت کو سمجھتا تو خوب مگر دوا علاج کیا خاک کرتا۔ زیادہ سے زیادہ وہی خیراتی ہسپتال کی دوائیں جن میں لڑائی شروع ہونے کے بعد سے دوا تو برائے نام تھی ہاں پانی ہی پانی ہوتا۔ سرکاری ہسپتال میں دی جانے والی دوائیں سرکاری دبدبے کا خیال نہ کرتے ہوئے الٹا نقصان ہی پہنچاتیں۔ وہ جب اچھن کی ماں کے لیے کچھ نہ کر سکا تو اچھن کے لیے کہاں سے ڈاکٹر پکڑ لاتا۔ پہلے بھی دس روپیہ پاتا تھا اور اب بھی۔ ہاں روپے کی قیمت بازار میں پہلے سے کہیں زیادہ گھٹ گئی تھی۔ جب اچھن کی ماں مری تھی تو بازار میں آٹا چار سیر کا مل جاتا تھا اور اب ڈھائی سیر کا بھی مشکل سے ملتا' ہر چیز مہنگائی کی انتہا کو پہنچ چلی تھی۔ لیکن دکان کا پرانا منشی اتنا ہی سستا تھا جتنا بیس سال پہلے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے لڑائی شروع ہونے سے قبل جو چیزیں دو پیسے کو لے کر دکان میں بھری گئی تھیں۔ وہ لڑائی شروع ہوتے ہی مہنگی ہوتی گئیں۔ یہاں تک کہ دو پیسے کی چیز نے آٹھ دس گنا نفع دیا' گویا چیزیں جیسے جیسے پرانی ہوتی گئیں ویسے ویسے قیمتیں بھی۔ لیکن اس پرانے منشی کے دس روپے کی قیمت بازار میں گھٹتی ہی چلی گئی۔ دکان میں ہن برس رہا تھا۔ مالک کے نام پر بینک میں سونے چاندی کے پہاڑ کھڑے ہو رہے تھے تو اسے کیا۔ وہی مثل کی بی بی عید آئی۔ جواب ملا' دور موئی تجھے اپنی ٹکیا روٹی سے مطلب۔ اسے تو جیسے دس روپوں کے سائے میں بٹھا دیا گیا تھا جہاں ضروریات زندگی کی قیمتوں کا روز بروز تنگ ہی ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے سنا کہ مل مزدوروں نے مہنگائی بھتہ لینا شروع کر دیا۔ کسانوں کی بن آئی معمولی دکانوں کے ملازموں کی تنخواہوں میں بھی اضافہ ہو گیا اور یہاں تک کہ بوجھ اٹھانے والوں نے بھی اپنی مزدوری بڑھا دی تو اس کے دل میں بھی امنگ اٹھی کہ مالک سے اصف کہہ دے کہ میری تنخواہ بڑھاؤ۔ لیکن شاید مالک نے اس کا خیال بھانپ کر پہلے ہی سے ہر وقت سنانا شروع کر دیا کہ منشی جی بڑھاپے سے تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اب گھر بیٹھو نوکری چھوڑ کر۔ یہ دیکھو تم نے حساب میں اتنی اتنی رقم ابھی نہیں جوڑی۔ مجھے منشیوں کی کمی نہیں۔ میں تو تمہارے پرانے ہونے کا خیال کرتا ہوں' سمجھے۔'' آئے دن یہ سن سن کر اس کا جی سوکھتا کہ کہیں ان دس روپوں کے بھی لالے نہ پڑ جائیں اور وہ اس دن کو کوستا جب اس کے دل میں تنخواہ

بڑھوانے کا منحوس خیال آیا تھا۔ اچھن سوکھتی جارہی تھی' اسکے لیے وہ انتہائی فکر مند تھا۔ پاس پڑوس والے کہتے کہ منشی جی! جب لونڈیا کو کھلا پہنا نہیں سکتے' بیمار ہے تو کوڑی کی دوا نہیں دے سکتے تو اسے اپنے گھر بار کا کردو۔ کھائے پہنے گی تو آپ ہی آپ اچھی ہو جاوے گی۔ لیکن مشورہ دینے والے جیسے یہ سوچتے ہی نہ تھے کہ غریب کی لڑکی غریب ہی کے گھر جائے گی۔ کسی دس بارہ روپے پانے والے کی عورت کیا پہنے گی اور کیا کھائے گی۔ آخر اچھن کی ماں بھی تو شوہر والی تھی کون سا سکھ اٹھا لیا غریب نے؟''

اچھن کو اس قدر عجیب طریقے سے کھڑے دیکھ کر باپ کی طبیعت الجھتی ہی چلی جارہی تھی۔ اچانک اسے خیال آیا کہ کہیں وہ اس کے بیڑی پینے کے بارے میں تو اتنی رنجیدہ نہیں ہوگئی۔

''اچھن! اس طرح کیوں کھڑی ہے؟ لے اب میں بیڑی نہیں پیوں گا۔''

''کچھ نہیں ابا'' اس نے دیوار سے سر اٹھا کر غور سے باپ کی طرف دیکھا۔ ''میں سوچ رہی تھی کہ چراغ کی لو بڑھا دوں ذرا۔'' اس کے لہجے میں بڑی آرزو اور خوشامد تھی۔

لیکن یہ سن کر باپ پر سے جیسے بھاری بوجھ ہٹ گیا۔ اتنی معمولی سی بات تھی جس کے لیے وہ اتنی دیر سے یوں کھڑی تھی۔ اس نے سوچا کہ سچ مچ اچھن کا دماغ چل گیا ہے۔ اندھیرے کو روشنی میں تبدیل کرنے کا خیال اس کے نزدیک پاگل پن تھا۔ مگر آخر کیوں؟

اس نے کہا۔

''جانتی ہے کہ اٹھواروں میں کہیں دو پیسے کا مٹی کا تیل نصیب ہوتا ہے اس پر بھی بھیڑ بھاڑ میں پیروں کا قیمہ بنتا ہے' کپڑے پھٹتے ہیں۔ کب سے کہہ رہا ہوں کہ تیل پر کنٹرول ہے اور تو ہے کہ روز بروز لو بڑھانے کی ضد کیا کرتی ہے۔''

''تو کیا فائدہ ایسے اجالے سے۔ دکاندار اتنا تیل بھی نہ دیا کرے۔ اس سے تو اندھیرا پڑا رہے۔ نام تو نہ ہو چراغ جلنے کا۔'' اس کی آنکھوں میں چمکتی ہوئی آرزو کے ننھے ننھے دیے اچانک بجھ گئے۔

''فائدہ وائدہ نہیں معلوم مجھے۔ بس اتنا ہی تیل ملے گا کہ چراغ جلتا رہے۔'' باپ کی آواز تیز ہوگی جیسے اس احساس نے اسے غصہ دلا دیا ہو۔

''چاہے روشنی نہ ہو!'' اس کے ہونٹ پھڑک اٹھے۔

''ہاں'' باپ کا جواب گھر کی سنسان تاریکی کو اور بھی تاریک کر گیا۔

''میرا تو جی الٹتا ہے ایسے اجالے سے۔'' اس نے مردہ سی آواز میں کہا۔ لیکن باپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جیسے وہ بیٹی کے

بات بات میں جی گھبرانے سے ناراض ہو گیا ہو۔

وہ مایوس ہو کر لڑکھڑاتی ہوئی دالان سے نکل آئی اور اپنی چارپائی پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ اسے اپنے ابا پر غصہ آرہا تھا کہ آخر وہ اس برائے نام روشنی پر قناعت کیوں کرتے ہیں؟ مٹی کا تیل اسے روزانہ کیوں نہیں ملتا۔ جبکہ گلی کے نکڑ والے خوبصورت دو منزلہ گھر میں تمام رات بڑی بڑی لالٹینوں کی روشنی ہوتی رہتی ہے۔ لیکن اس کا جھنجھلایا ہوا دماغ یہ سوچ ہی نہ سکا کہ اگر تیل لڑے بھڑے ملنے بھی لگے تو اس مد کے لیے دو پیسے روز کس کے گھر سے آئیں گے جبکہ اس کے باپ کو سخت محنت کی قیمت صرف اتنی ہی ملتی ہے کہ وہ جئے تو کیا' ہاں جینے کی بھونڈی سی نقل اتارتا رہے۔ بالکل اسی طرح جیسے سیاہ طاق میں رکھا ہوا چراغ۔ جس کی مدھم روشنی پر چاروں طرف سے اندھیرا امنڈ رہا تھا۔

اچھن پیچ و تاب کھاتی اپنی چارپائی پر لڑھک گئی۔ اس کا جی گھبرا رہا تھا اور ہر طرف سے سفید نئے کپڑوں کی کھڑکھڑاہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ زور زور سے رو کر اپنے ابا کی قناعت پسندی کا ڈھنڈورہ پیٹے۔ لیکن اس سے رویا بھی نہ گیا۔ آنسوؤں کا ذخیرہ تو جیسے حلق میں ہی پھنس کر رہ گیا تھا۔

◆◆◆

کوٹھی اور کوٹھڑی

چھنن چھنن...... جمن خانساماں کباب تل رہا تھا۔ خالص گھی کی خوشبو میں ملی جلی کبابوں کی ''معدہ کش'' خوشبو سے نتھو بیرے کی مضمحل بھوک ایسی طاقتور ہوگئی کہ پورے پیٹ میں گڑبڑ مچادی۔ اس نے خالی کشتی زمین پر رکھ دی اور اپنے پھیلے پھیلے نتھنے پھڑ کاتا' منہ میں چھنتے ہوئے پانی کے گھونٹ حلق سے اتارتا' بید کے مونڈھے پر سکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کی حریص نظریں انگاروں پر رکھی ہوئی کڑھائی پر اس طرح جم گئیں جیسے کبھی ہٹنے کا نام نہ لیں گی۔ کڑھائی سے سرخ سرخ کبابوں کا ہلکا چٹپٹا دھواں نکل رہا تھا اور نتھو کی خالی آنتیں بری طرح اینٹھ رہی تھیں۔ صبح سے اس نے ایک باسی روٹی کے سوا کچھ بھی نہ کھایا تھا اور اب رات بھی فاقے سے گزرنے کی نوبت تھی۔ مہینے کے آخر دنوں میں اکثر اسے فاقے کی آؤ بھگت کرنا پڑتی۔ بیس روپیہ خشک پر ملازم' یہ رقم اس مہنگائی کے زمانے میں کس طرح پوری ہی نہ پڑتی تھی۔ پہلے تو خیر کسی نہ کسی طرح گزارا ہو ہی جاتا تھا۔ لیکن اس نے شادی کیا کی۔ دل کے سکھ کے لیے پیٹ کا دکھ ہو گیا۔ اس کی نئی نویلی دلہن ہزار طرح کے نخرے کرتی۔ پورا نہ پڑنے پر اس کا باپ' ایک بڑے گھرانے کا باورچی تھا۔ اس لیے بیٹی نے بھی زبان کا مزا خوب اٹھایا تھا چوری کے کھانوں سے۔ اور اب جو پلے بندھی نتھو کے' تو یہاں وہ بات کہاں؟ بس اس لیے بات بات پر منہ پھلاتی' اپنی قسمت کی کوستی' اور مارے نخروں کے ناک میں دم رکھتی۔ شروع شروع میں تو نتھو جانے کہاں کہاں سے ادھار مانگ کر اس کو منا لیتا۔ لیکن آخر کب تک کوئی قرض دیے جاتا۔ ایک کا بھی تو ادا نہ کرتا نتھو۔ بس مہینے کے آخر دنوں ضرور دو تین دن کا فاقہ پڑ جاتا اور نتھو تھا کہ رونی صورت بنائے پھرتا۔ چھوٹے سے دل اور دماغ کا آدمی تھا اس لیے فاقے کو اپنی اور اپنی عورت کی تندرستی کے لیے زہر سمجھتا تھا۔ ورنہ اس کی میم صاحب تو گھر میں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی مہینے میں دو دن کا فاقہ کرنا ضروری خیال کرتیں۔ صرف اس لیے فاقہ صحت کے لیے مفید ہوتا ہے۔ لیکن نتھو تو چھوٹا آدمی تھا' اس لیے ان بڑی بڑی باتوں کو کیا خاک سمجھتا۔ بس اس کا تو جی یہی چاہ رہا تھا کہ مونڈھے پر سے اچک کر چھنن چھنن کرتی ہوئی کڑھائی میں ہاتھ ڈال دے اور جلتے ہوئے کباب ایک دم نگل جائے۔ لیکن جمن خانساماں جو بیٹھا تھا ہاتھ میں کفگیر لیے اپنی سیاہ گھنی مونچھوں پر خوفناک تاؤ دیے۔ کم بخت کی مونچھیں ایسی نکیلی اور ناک کی طرف مڑی ہوئی تھیں جیسے دو بڑے بڑے سیاہ بچھو اپنے ڈنگ اٹھائے بیٹھے ہوئے ہوں اور اس کی

بیچاری ناک ان دو سیاہ نوکروں کے درمیان بڑی مظلوم سی دکھائی دیتی۔ جمن' میم صاحب کا چہیتا اور منہ چڑھا نوکر تھا۔ اس لیے کوٹھی کے سب ملازموں کو اپنے سامنے اتنا ہی بے بس رکھتا جتنا اپنی ناک کو اپنی مونچھوں کے درمیان۔ وہ جس نوکر سے کسی بھی بات پر چل جاتا' اسے نوکری سے الگ کروائے بغیر چین نہ لیتا اور نتھو یہ سب جانتا تھا۔ اسے اپنی نوکری بہت عزیز تھی۔ برسوں مل کی پرشور فضا میں کام کرنے کے بعد اور مہینوں ڈلیا ڈھونے کے تجربے نے اسے اس نوکری پر جم جانا سکھا دیا تھا۔ بس نتھو کی بھوک اندر ہی اندر اس طرح گڑبڑ مچائے ہوئے تھے جس طرح گھر کی چار دیواری میں بند کسی بہت ہی جوان لڑکی کے ستے اور گندے جذبات۔

بجلی کی سفید روشنی میں سرخ سرخ کباب تیار ہوتے جا رہے تھے اور نتھو اپنی سفید زین کی پتلون پر ہتھیلیاں رگڑ رگڑ کر غٹ غٹ رال کے گھونٹ اتارتا جا رہا تھا۔

''کیوں بیٹا! کیا آنکھوں ہی آنکھوں میں کھا جائے گا کباب؟'' جمن نے زہر میں بجھی بولی بول کر گھی میں تر انگلیوں سے اپنی مونچھوں کو تھپکا اور پھر زور سے ہنس پڑا۔ اسے معلوم تھا کہ اکثر مہینے کے آخر دنوں میں باورچی خانے میں قدم رکھتے ہی نتھو کی آنکھوں میں حریصانہ چمک کیوں پیدا ہو جاتی ہے اور گردن کی نوکیلی ہڈی بار بار کس لیے حلق کی طرف چڑھتی اترتی رہتی ہے؟

''نہیں بھیا! مرچیں ہوں گی ان میں' آنکھیں پھوٹ جائیں گی'' نتھو نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ ''آخر مہینہ ہے نا بھیا' چولہا بھی ٹھنڈا پڑا ہے۔ میرا کچھ نہیں' پر تیری بھابی کا خیال ہے۔'' نتھو یہ کہتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ شاید جمن کو کچھ رحم آ جائے تو وہ تھوڑا سا کھانا یا کچھ پیسے دے دے۔

''میرے یار یوں کام نہیں چلے گا۔'' جمن بولا۔ اور ایک آنکھ ذرا سی دبا کر ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ ''بھابی! پتلی کمریا' بالی عمریا ......ہی ہی''

جمن ہمیشہ نتھو کی عورت کا نام آتے ہی اسی طرح ایک آنکھ میچ کر ہنستا تھا۔ اسے اس کے بھوکے ہونے کی اتنی پرواہ نہ تھی جتنی اس کی پتلی کمریا اور بالی عمریا کی۔ نتھو کے دماغ میں جیسے کوئی چیز ایک دم جل کر بجھ گئی۔ بھوک پھر مضمحل ہو گئی اور غیرت جاگ اٹھی اس کا جی چاہا کہ وہ جھپٹ کر جمن کی بڑی بڑی مونچھوں کو پکڑ کر جھول جائے۔ اس کی آنکھیں نکال لے اور دانت توڑ ڈالے۔ ''بدمعاش نہیں تو! حرام کی روٹیاں کھا کھا کر بہت پھولا ہوا ہے۔ ایک کمائی کرنے والی عورت کے سیدھے منہ بات کر لینے سے دماغ بگڑ گیا ہے سور کا' کتا نہیں تو۔'' نتھو کے دماغ میں ہل چل مچ گئی کہ جمن کے ساتھ جانے کیا کچھ نہ کر کے اور کہہ کے' اس کی آنکھ دبا کر ہنسنے کا بدلہ لے لیا جائے۔ لیکن وہ مونڈھے پر سے ہل بھی نہ سکا۔ جمن دانت نکالے بڑی بے فکری سے کباب تلے جا رہا تھا۔ چھنن چھنن۔

”صاحب کو شراب کے ساتھ کباب بہت پسند ہیں۔ یار! صاحب کے تو پوں بارہ رہتے ہیں ہمیشہ' میم صاحب کیا ٹکسال ہیں کہ کبھی روپے کی کمی ہی نہیں ہوتی' صاحب ان کے ہوتے۔“ جمن نے نتھو کو دیکھتے ہوئے ذرا شک سے کہا اور نتھو جو پتھر کے بت کی طرح مونڈھے پر جما ہوا تھا جلدی جلدی پلکیں جھپکانے لگا۔ جمن تلے ہوئے کباب چینی کی پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہتا ہی رہا۔

”ایسی ہی کوئی سالی عورت مجھے مل جائے تو ایک سال کے اندر اسی کوٹھی کے برابر اس سے اچھی کوٹھی کھڑی کرا لوں گا میں بھی۔“

یہ سن کر نتھو کے دماغ میں پھر جیسے کوئی چیز بھک سے جل کر بجھ گئی۔ آخر وہ اتنا بیوقوف تو نہ تھا کہ جمن کا اشارہ نہ سمجھتا۔ اس نے تلملا کر اپنے حساب جمن کے منہ پر جوتا مارنے کو کہا۔

”ارے بھیا! صاحب بڑے آدمی ہیں' ان کی بڑائی ہی ان کی عزت ہے۔ ہم تم غریب لوگ ہیں' عزت ہی کو عزت سمجھتے ہیں اور موقع پڑے پر اس کی خاطر خون بہانے سے بھی نہیں چوکتے۔“

”ہی ہی ہی“ جمن نے اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے آنکھ دبا دبا کر اسی مخصوص انداز میں ہنسنا شروع کر دیا۔ جس سے نتھو کے سارے جسم میں مرچیں لگ جاتی تھیں۔ ”بھوکا ہے یار' اس لیے الٹی سیدھی سوچتا ہے۔ جا' بھابی کو ادھر بھیج دیجو' کباب روٹی دے دوں گا۔“

”نہ بھیا! رہنے دے' اللہ کی مرضی اگر اس میں ہے کہ ایک رات بھوکے سو رہیں تو کیا حرج ہے۔“ نتھو نے اپنے پیٹ کی گڑگڑاہٹ کو نظرانداز کرتے ہوئے بڑی رکھائی سے کہا اور جیسے اس کی روح جھوم اٹھی کہ او ہو! وہ بھی اتنا بلند انسان ہے کہ عزت کے لیے بھوکا رہنا گوارا کر سکتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اسے اپنی جسمانی کمزوری کا شدید احساس ہوا کہ کاش وہ بھی جمن کی طرح خوب موٹا تازہ ہوتا تو مزا چکھا دیتا میاں جمن کو ایسی کچی بات منہ سے نکالنے کا۔ جب دیکھو جب وہ کم بخت یونہی انٹ شنٹ مشورے دیا کرتا نتھو کو جیسے اس بدمعاش کی اماں تھی ہی نہیں۔ وہ اکثر نتھو کی عورت سے بڑھ بڑھ کر مذاق پر اتر آتا۔ جس کی شکایت کئی بار نتھو سے بھی ہوئی۔ اس کم بخت نے رشتہ بھی تو کتنا لوچدار لگا رکھا تھا اس کی عورت سے۔ وہ اسے تاؤ میں آ کر ڈانٹ بتانے کی ہمت بھی کرتا تو بات ہنسی مذاق میں اڑ جاتی۔

ٹن ٹھنن ...... دیواروں پر لگی ہوئی برقی گھنٹی بالکل نتھو کے کان کے پاس بجی اور نتھو ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔ کبابوں سے بھری پلیٹ کشتی میں رکھ کر چلنے لگا تو جمن نے پھر اس کی دکھتی رگ پکڑی۔

”دیکھ یار! راستے میں کھا مت لیجو۔“ اور نتھو کے جسم میں جیسے آتشبازی کی چھچھوندر چھوٹ گئی۔ وہ بے بسی سے ہونٹ کاٹتا ہوا

باورچی خانے سے باہر نکل گیا۔ اب مارے رنج اور ندامت اسکی بھوک مر گئی تھی۔ وہ اس طرح منہ اٹھائے کھانے کے کمرے تک گیا جیسے اس کے ہاتھوں میں کباب نہیں بلکہ کوئی بہت ہی غلیظ چیز ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جمن اسے سمجھتا کیا ہے؟ وہ غریب ضرور ہے' غلیظ ہرگز نہیں جو چوری کرنے لگے یا ایک عورت رکھ کر کوٹھی بنانے کی فکر کرنے لگے۔

”ہاہاہا“ صاحب ہنس ہنس کر پی رہے تھے اور پی پی کر ہنس رہے تھے۔ نتھو کو دیکھ کر پھنکارے۔ انکی زبان بری طرح لڑکھڑا رہی تھی۔

”ابے رکھ دے کباب اور مرغا بن کر دکھا مجھے۔ مرغا بن کر' سمجھا کچھ؟ ایں“ صاحب پر شراب اپنا پورا رنگ چڑھا چکی تھی۔ ان کی آنکھیں کچھ چڑھی ہوئی تھیں اور چہرے پر ورم سا تھا۔ نتھو نے ان کے حکم کو سنا ان سنا کر کے چوری چوری ادھر ادھر دیکھا۔ میم صاحب معہ اپنے نئے مہمان کے کمرے سے غائب تھیں اور کمرے سے ملحق خوابگاہ کے دروازوں میں لگے ہوئے شیشوں کے اس پار سنسان اندھیرا تھا۔ نتھو نے ایسا برا منہ بنا کر پلیٹ میز پر رکھ دی جیسے اس نے کوئی کڑوی سی چیز نگل لی ہو۔ حالانکہ وہ تقریباً روزانہ یہی تماشہ دیکھتا تھا لیکن آج نہ جانے کیوں وہ اس اندھیرے کو دیکھ کر بجائے سستی سی لذت حاصل کرنے کے کچھ پریشان سا ہو گیا۔

”ابے! تو دیکھتا کیا ہے؟ اے! شراب پینا برا ہے؟ میری عورت دوسرے کے پاس ہے' یہ بھی برا ہے' کیوں؟ پر جب میری ٹانگ کٹ گئی تھی ریل تلے تو کیا میری شاندار نوکری کے ساتھ پیٹ بھی کٹ گیا تھا میرے جسم سے؟ مجھ سے تو کسی کو ہمدردی نہ ہوئی۔ ہوئی تو میری عورت سے۔ خوبصورت اور جوان عورت سے۔ آہا! یار لوگ مجھ لنگڑے کے سہارے کو چھین لینا چاہتے تھے۔ وہ سب اس سے کہتے تھے کہ تیری زندگی خراب ہو گئی۔ آ ہم تجھے لے چلیں اپنے ساتھ۔ یہ لنگڑا اب تجھے کچھ بھی نہیں دے سکتا۔ کچھ بھی نہیں۔ سمجھا؟ وہ میرے یار عورت کی جوانی دو میٹھے بولوں اور دو ٹانگوں کے عوض خریدنا چاہتے تھے۔ پر یہ کیسے ہو سکتا تھا' اور اب تمام وہی لوگ ایک وقت میں اپنی بھری جیبیں میرے سامنے خالی کر دیتے ہیں۔ ہاہاہاہا..... پر مجھے تو بری بری نظروں سے نہ دیکھ' مجھے کوئی بھی برا نہ کہے۔ میں نے وہی کیا جو میرے نہ چاہنے کے باوجود بھی ہوتا۔“ صاحب نے نشے میں جھوم جھوم کر بکواس جو شروع کی تو سلسلہ دیر تک ختم نہ ہوا۔ وہ ہر رات کو زیادہ پی جانے کے بعد اپنے سسکتے ہوئے ضمیر کی دبی دبی کراہ کو اسی طرح گھونٹنے لگتے۔ شرابی ویسے ہی نشے میں بہت زیادہ صاف گو ہو جاتا ہے لیکن صاحب تو اپنی پوری زندگی کو بالکل ہی ننگا کر دیتے۔ دن میں وہ کتنے سنجیدہ بلکہ کسی قدر خوفناک سے نظر آتے تھے۔ اچھے اچھے لوگوں کی زبانیں لڑکھڑا جاتیں ان سے بات کرتے ہوئے اور نوکروں کی تو مجال نہ تھی دم مارنے کی ان کے سامنے' فضلو مالی جو نوکروں کے بیچ میں چرس کا دم لگانے کے بعد صاحب کو گالیاں تک دینے سے نہ چوکتا تھا۔ ان کی

ایک آواز پر کانپ جاتا اور نتھو بیچارہ تو ویسے ہی منحنی اور دبو سا آدمی تھا۔ دنیا کی سختیاں جھیلے ہوئے اس قدر آرام دہ نوکری کو دانتوں سے پکڑے رہتا۔ پھر بھلا کیوں نہ صاحب سے ہر وقت رعب کھاتا؟ خواہ صاحب نشے میں دھت کیوں نہ ہوں۔ مارے ڈر کے آنکھ نہ اٹھاتا۔ تو اس وقت بھی وہ بت بنا کھڑا تھا۔ صاحب کی بکواس جو جواب بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اور بھی اس کے پاؤں پکڑے ہوئے تھی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں صاحب اس حالت میں گڑگڑا نہ پڑیں۔ اس سے وہ ایک بار یوں ہی روتے روتے میز پر اوندھے گئے تھے اور گلاسوں کے ٹوٹ کر چبھ جانے سے ان کی پیشانی سے خون نکلنے لگا تھا اور میم صاحب ان کا خون دیکھ کر پاگل سی ہو گئی تھیں۔ انہوں نے بید چکا چکا کر سارا الزام بیچارے نتھو پر ہی رکھ دیا کہ تو کہاں چلا گیا تھا انہیں مدہوش چھوڑ کر۔ میم صاحب کا تو نتھو کو یہ حکم تھا کہ میری عدم موجودگی میں صاحب کے پاس اس وقت تک رہو جب تک وہ اپنے بستر پر نہ چلے جائیں۔ بس! یہ مجبوری تھی نتھو کے لیے' ورنہ وہ تو کب کا سٹک جاتا باہر کی طرف۔ اس کا جی الجھ رہا تھا اور سر میں دھیمی دھیمی گھمری سمائی ہوئی تھی۔ کباب میز پر پڑے پڑے ٹھنڈے ہو رہے تھے اور نتھو کی بھوک آہستہ آہستہ گرم ہوتی جا رہی تھی۔ دماغ میں خیالات کی عجیب سی گڈمڈ تھی۔ جمن کے زہر میں بجھے ہوئے کچوکے' صاحب کی ہچکیاں' میم صاحب کے بید کی چمک' شراب کی بو' بیکار پڑے ہوئے کباب اور اس کی بھوک۔ نتھو پر ایسی جھنجھلاہٹ سوار ہوئی کہ اگر اس کا بس چلتا تو صاحب کا گلا دبا دیتا۔ میز پر پڑے ہوئے کباب اور صاحب کی جیب میں ٹھنسی ہوئی نوٹوں کی گڈی جھپٹ کر باہر بھاگ جاتا۔ اپنی عورت کی بانہہ پکڑتا اور پھر کہیں بہت دور نکل جاتا۔ جہاں یہ نوکری نہ ہوتی اور نہ یہ مجبوری۔ لیکن اندھیرے کے کمرے میں میم صاحب کی چوڑیاں کھنک رہی تھیں اور نتھو بہت ڈرتا تھا ان کی چوڑیوں بھری سفید سفید کلائیوں سے۔

رات کو کہیں بارہ بجے کے بعد وہ اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر کوٹھی سے نکلا اور سفید پتھریلی سیڑھیوں کو کانپتے ہوئے پیروں سے ہولے ہولے جھجکتا اترا اور پھر اپنا سر جھکائے کوٹھی کے پچھواڑے بنی ہوئی نوکروں چاکروں کی کوٹھریوں کی طرف چل دیا۔ شروع مہینے کا بتوا سا چاند' سڑک کنارے خاموش کھڑے ہوئے درختوں کی آڑ سے' سہمی سہمی روشنی اس کی راہ میں بچھا رہا تھا۔ موسم خزاں کی جھپٹ میں آتے ہوئے کتنے ہی سوکھے پتے اس کے قدموں تلے آ کر کھڑکھڑائے' چرمرائے لیکن وہ کسی سحر زدہ شخص کی طرح بے خبر سا چلتا ہوا اپنی کوٹھری کے نزدیک پہنچ گیا۔ کواڑ انگلی سے ٹھیلے تو وہ کھل گئے اور نتھو نڈھال سا کھوٹھری میں داخل ہو گیا۔

کوٹھری کی گرم اور امسی ہوئی فضا میں طاق پر رکھا ہوا چراغ بدبودار دھواں اگل رہا تھا اور نتھو کی عورت چارپائی پر بے سدھ پڑی سو رہی تھی۔ پپڑائے ہوئے ہونٹ کچھ کھلے کھلے سے۔ بھری بھری پنڈلیوں پر سے دھوتی ذرا سرکی ہوئی اور بالوں کی کچھ ننھی ننھی لٹیں

ماتھے پر سوئی ہوئی۔ نتھو نے ایک تھکی ہوئی سی نظر اس پر ڈالی اور اپنا کوٹ اتار کر کھونٹی پر ٹانگنے لگا۔ کوٹ ٹانگتے ہوئے' اس نے مارے نقاہت کے اپنے ہاتھ میں تیز لرزش محسوس کی تو اس کی آنکھیں بے اختیار آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ رگوں میں بھوک کی تیز سنسناہٹ زناٹے بھرنے لگی اور وہ مردہ سا ہو کر زمین پر پڑ گیا۔ اسے یہ احساس بری طرح ستانے لگا کہ وہ بھی کتنا مجبور ہے جو بھوکا ہونے کے باوجود سامنے پڑا ہوا بیکار کھانا نہیں کھا سکتا۔

چراغ کی لو دھواں اگلے جا رہی تھی۔ بدبودار سیاہ دھواں اور نتھو اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں چراغ پر گاڑے ہوئے تھا۔ اس کا جسم اس طرح بے حس و حرکت تھا جیسے وہ مر گیا ہو۔ بھوک کی شدت سے پیٹ میں ہلکی سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ تیز کھرچن محسوس ہو رہی تھی اور اس کے گڈمڈ خیالات کا پر شور بہاؤ موڑ پر آ گیا تھا۔ بڑے ہی خطرناک موڑ پر۔ اس موڑ پر جس کے خیال ہی سے وہ ذرا دیر پہلے جمن کی مونچھوں میں جھول جانے کی سوچ رہا تھا لیکن بھوک کا نشہ' صاحب کی پی ہوئی شراب کے نشے سے کہیں زیادہ مدہوش کن تھا۔ نتھو بہک بہک کر سوچ رہا تھا کہ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے اگر اپنے جسم کا کپڑا' ذرا دیر کو کسی دوسرے نے بھی پہن لیا۔ معاوضے میں اپنے دام بھی کھرے ہو گئے اور کپڑا تو پھر اپنا ہی ہے۔ میل کچیل کی کہو تو روپے کی آب ایسی کہ میل کچیل پر نظر ہی نہیں پہنچتی۔ دنیا والوں کی۔ صاحب بھی تو ہیں' ایک ٹانگ گھٹنے تک غائب' بالکل سوکھے سہمے سے' لیکن سبھی انکے سامنے پہنچ کر رعب کھاتے ہیں۔ سب آنے جانے والے میم صاحب سے زیادہ انہی کے ناز اٹھاتے ہیں اور سنا ہے کہ کوٹھی سے باہر بھی ان کی خاصی عزت ہے۔ بڑے بڑے کاموں میں انہیں ضرور دعوت دی جاتی ہے۔ ہماری طرح کالا مین ہوتے ہوئے بھی صاحب کہلاتے ہیں اور ان کی عورت میم صاحب۔ اور میم صاحب بھی تو بہت چاہتی ہیں صاحب کو' غرض سچ کہتا ہے کہ جمن کہ صاحب کے تو پوں بارہ رہتے ہیں۔ میرے پاس بھی یہی سب کچھ ہو جائے گا تو لوگ مجھے بھی صاحب کہا کریں گے اور میری مہریا کو میم صاحب! آہا پھر دیکھوں گا اس سالی دنیا کو جس نے ہمیشہ مجھے ٹھوکر ماری۔ اور ہاں وہ جمن کم بخت! چند روٹیوں اور کبابوں کے لیے میری عورت کو بلاتا ہے۔ ایسا ہی تو چوکھا ہے۔ بدمعاش نہیں تو۔ یہ تو اگر ایک لاکھ روپیہ بھی دے گا تو اسے صورت نہ دیکھنے دوں گا اپنی عورت کی۔

نتھو کے جسم میں ذرا جان آنے لگی۔ اس نے حقارت سے منہ بنایا اور غرور سے گردن گھما کر چارپائی پر بے سدھ پڑی ہوئی عورت کو اس طرح دیکھنے لگا جیسے اس کے ہاتھ میں ساری دنیا کی باگ ڈور ہے۔ چراغ کی ذرا مدھم روشنی میں سوئی ہوئی نوخیز عورت کا حسن جاگ رہا تھا۔ نتھو کی آنکھوں میں مسرت کی کرنیں جنم لینے لگیں کہ آہا کتنی خوبصورت ہے اس کی عورت اور اس کی قیمت جمن لگاتا ہے چند روٹیاں اور کباب! کیسا الو ہے جمن بھی۔

نتھو جی ہی جی میں مسکرایا اور پھر اس کی آنکھوں کے سامنے میم صاحب آ گئیں موٹاپے کی طرف مائل جسم' گوری رنگت' بڑی لیکن گول آنکھیں' قدرے چپٹی ناک' اور موٹے موٹے ہونٹ۔ ایسے ہونٹ جو سرخی چھٹنے کے بعد جونکوں کی مانند دکھائی پڑتے خون چوس کر پھولی ہوئی کالی کالی جونکیں۔ کچھ زیادہ اچھی نہ تھیں وہ۔ اس پر بھی وہ سو روپیہ سے کم پر کسی سے بات کرنا بھی گوارا نہ کرتیں۔ بس ان کے دم سے کوٹھی میں دولت کی ریل پیل تھی۔ ان کے مقابلے میں اس کی عورت کتنی خوبصورت اور کس قدر نازک تھی تو کیا وہ محل بنوا دینے سے قاصر ہو سکتی تھی؟

نتھو کے جی پر مسرت کا گدگدا سا بوجھ لحہ بہ لحہ بھاری ہونے لگا اور اس کی کھلی ہوئی آنکھوں کے سامنے چراغ کی کپکپاتی ہوئی لو نے بڑے سے برقی قمقمے کا روپ دھار لیا اور اس کی نیم تاریک کوٹھڑی بڑی سی شاندار سجی سجائی کوٹھی میں تبدیل ہو گئی۔ کوٹھڑی کے ایک کونے میں بنا ہوا چولہا جس میں ٹھنڈی راکھ اٹی پڑی تھی' ایک دم گرم ہو گیا اور ایک جمن جیسا باورچی گرم و سرخ کباب جھپا جھپ اتارنے لگا.... آہا۔

نتھو کے جسم میں جانے کہاں سے طاقت بھر گئی اور وہ اٹھ کر اپنی عورت کی چارپائی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ وہ اب تک بے خبر سو رہی تھی۔ وہی کھلے کھلے ہونٹ' بکھری سی لٹیں اور ننگی پنڈلیاں۔ جیسے وہ تھکان سے چور چور ہو کر آرام کی نیند سوئی ہو۔ نتھو ہولے سے اس پر جھک گیا اور اس طرح ہولے ہولے اس کے جسم پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ جس طرح کپڑے کی کسی دکان پر کوئی دہقان ریشمی کپڑے کے تھان کو چھوئے' بہت پیار سے' بالکل دھیرے دھیرے کہ کہیں کوئی شکن نہ پڑ جائے' کہیں میلا نہ ہو جائے۔ اس وقت سے پہلے اس عورت کا جسم اسکے لیے میلے ہاتھ پونچھنے کے تولیہ سے بھی بدتر تھا مگر اب؟ اب تو وہی جسم اس کے لیے سب کچھ تھا۔ نتھو کا جی چاہا کہ وہ اسے جگا کر اپنی جنت کی راہ بتا دے۔ لیکن پھر یہ سوچ کر اس کے قریب سے ہٹ آیا کہ کہیں وہ بھڑک نہ جائے سن کر' جب اس راہ پر قدم رکھ دے گی تو پھر آپ ہی آپ عیش و آرام کی جگمگاتی ہوئی دنیا کی طرف لپکنے لگے گی۔

نتھو نے اپنے فیصلے سے مطمئن ہو کر ایک انگڑائی لی۔ ایک دم کئی کٹورے پانی پیا اور طاق پر سے بیڑی کا وہ ٹکڑا اٹھا کر سلگایا جو وہ صبح بے خیالی میں طاق پر پھینک گیا تھا۔

رات کا خوفناک ناگ تیزی سے رینگ رہا تھا اور نتھو کے عزائم ہر لحہ پختگی انتہا کو پہنچ رہے تھے۔ اس کی بھوک زندہ تھی اور روٹی حاصل کرنے کا خیال جوان!

نتھو کے اندر چھپ کر بیٹھا ہوا انسان گونگا ہو گیا تھا یا شاید وہ بھی بھوکا ہو۔

دوسرے دن.....

رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ میم صاحب کی مسکراہٹ میں دعوت اپنے شباب پر تھی۔ شراب کی کئی بوتلیں کھل کر اڑ چکی تھیں۔ دونوں مہمانوں میں سے موٹا مہمان پی کر بالکل ہی بے آپے تھا۔ وہ میم صاحب سے جانے کیا فضول بکواس کر رہا تھا اور صاحب کے ماتھے پر ایک تیوری ابھر رہی تھی۔

دوسرے دبلے پتلے نوجوان مہمان نے گلاس سے آخری گھونٹ پی کر جیب میں ہاتھ ڈالا اور نوٹوں کی ایک گڈی صاحب کے سامنے رکھ دی۔ نتھو نے صاحب کے ساتھ کنکھیوں سے گنا۔ دس دس روپے کے بارہ نوٹ تھے اور نتھو کا جی للچا کر رہ گیا۔ موٹے مہمان نے بھی جھوم کر جیب میں ہاتھ ڈالا اور نوٹوں کی ایک گڈی صاحب کے سامنے پھینک دی۔ نتھو نے پھر گنا۔ دس دس روپے کے بیس نوٹ! نتھو کا سینہ مارے لالچ کے پھٹنے لگا۔ صاحب نے موٹے مہمان کے نوٹ اپنی جیب میں ٹھونس لیے۔ اب ان کے ماتھے کی تیوری اتر چکی تھی۔ میم صاحب مسکراتی ہوئی موٹے مہمان کے ساتھ کھڑی ہو گئیں۔ دوسرے مہمان کے نوٹوں کی گڈی بے قدری سے میز ہی پر پڑی رہی۔

"اور کباب لا" صاحب نے اپنے گلاس کی بچی ہوئی شراب حلق میں انڈیلنے کے بعد جھوم کر کہا اور نتھو چونک کر باہر نکل گیا۔

نتھو جب کباب لے کر لوٹا تو دیکھا کہ دوسرا مہمان بکتا جھکتا کمرے سے نکل رہا تھا۔ نتھو نے جلدی سے کباب صاحب کے سامنے رکھے اور پھر تنہا بیٹھے ہوئے صاحب کو گالیاں بکتا چھوڑ کر' دوسرے مہمان کے پیچھے لپک گیا' بالکل اندھا ہو کر۔ اسے روٹھے ہوئے نوجوان مہمان کے بچے ہوئے ایک سو بیس روپے وصول کرنا تھے۔ وہ سیڑھیاں اترتے ہوئے گرتے گرتے بچا' گملوں سے ٹکرایا لیکن پھر بھی اندھا دھند دوڑتا رہا۔ اور آخر اس نے جھومتے جھامتے مہمان کو اس کی موٹر کے پاس جا پکڑا۔

"صاب! صاب! ذرا رکیے!" نتھو جیسے اس سے بھیگ مانگ رہا تھا۔

"اور نہیں! ام نہیں جائیں گے۔ تم کو اش لنگڑے نے بھیجا ہے۔ ام نہیں جائیں گے۔ ام اس موٹے کو مار ڈالیں گے۔" وہ بہت جلا ہوا تھا۔

"صاب! وہ موٹی عورت تو بہت بری ہے۔ آپ میرے ساتھ آئیے' میں لے چلوں حضور کو' عورت نہیں پری ہے پری۔ ابھی بالکل کمسن ہے صاب!" نتھو نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا اور صاحب جھومتے جھامتے اسکے ساتھ ہو لیے۔

نتھو نے آگے بڑھ کر کوٹھڑی کا دروازہ کھولا اور صاحب ڈگمگاتے ہوئے کوٹھڑی میں چلے گئے۔

بند دروازے کے قریب نھتو چپ چاپ کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک سو بیس روپے کے نوٹ کھڑ کھڑا رہے تھے۔ اور اس کے دماغ کے پردوں پر کوٹھی کی بنیاد رکھی جا چکی تھی۔ لیکن جانے کیوں اس کی نس نس میں ایک ستا سا خوف سرایت کر گیا تھا۔ ایسا خوف جیسا کہ بے خبری میں قریب سے چوہیا نکل جانے پر محسوس ہوتا ہے۔

صاحب کو موٹر میں بٹھا کر وہ واپس آیا تو دیکھا کہ اس کی عورت چارپائی پر اوندھی پڑی سسکیاں لے رہی تھی۔ وہ جھجکتا ہوا اس کے قریب بیٹھ گیا اور پھولی پھولی سانسوں کے درمیان کہنے لگا۔

''روتی کاہے کو ہے ری' پگلی تو نہیں تو۔ ساڑھیاں لے دوں گا چمکتی ہوئی اور رہنے کو محل بنوا دوں گا تیرے لیے۔ اس میں حرج بھی کیا ہے؟ میم صاحب کو دیکھ' عزت وزت کوئی چیز نہیں۔ جب تو نے یہ نہیں کیا تھا تو بھی میری تیری کون سی عزت تھی۔ کون مجھے یا تجھے سر پر بٹھاتا تھا سوائے گالی سے بات کرنے کے' کون ہمارے صبر شکر کی داد دیتا تھا' سوائے ہنسی اڑانے کے۔ اور سچ پوچھ تو روپیہ ہی عزت ہے' طاقت ہے۔ لا روپے دے مجھے' لا۔''

نھتو جلدی جلدی تھوک نگل رہا تھا۔

عورت کے ڈھالے ڈھالے جسم میں جیسے ایک دم بجلی بھر گئی۔ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ ''ایں'' وہ آنکھیں نکال کر بڑی حقارت سے چلائی۔ ''بڑا آیا ہے محل بنوانے والا' جانے کس کو پکڑ لایا تھا حرامجادہ! لے یہ دولت دے گیا ہے وہ تیرا باپ'' اس نے تکئے کے نیچے سے ایک روپیہ نکال کر زمین پر پھینک دیا۔ نھتو کی آنکھوں کے سامنے وہ ایک روپیہ چمکا اور پھر جیسے بجھ گیا۔ کوٹھی کی بنیاد برابر ہو گئی اور جیسے اسے اپنے سارے جسم میں بڑے بڑے پھوڑے اٹھتے معلوم ہونے لگے۔ ایسے پھوڑے جن کی گرمی اور ٹپکن ناقابل برداشت ہو۔ ایک روپیہ' صرف ایک روپیہ ایک کی بالی عمریا اور پتلی کمریا والی عورت کی قیمت۔ اور سینکڑوں روپے اس موٹی میم صاحب کی قیمت نھتو کا سر جھکتا ہی چلا گیا۔ اس کی عورت بھی تو کتنی ناراض تھی جیسے اس نے یہ سب کچھ اپنے ہی لیے تو کیا ہو۔

اس کی عورت سسکیاں لیتے ہوئے کہے گئی۔

''جانے کون تھا حرامجادہ کہ آیا تو بڑے ٹھسے سے' پر جیب سے نکلا ایک روپیہ' موت پڑے اس پر۔ اس سے تو اچھا جمن' جس نے کل بھی مجھے کباب روٹی کھلائی اور آج بھی' اوپر سے پانچ روپے دیئے۔

نھتو کا جھکا ہوا سر ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔ دماغ میں کوئی چیز بارود کی طرح بھک سے جل گئی۔

''جمن! تو جمن سے روٹی لینے گئی تھی تو نے اس سے روپے لیے؟'' وہ اس طرح گلا پھاڑ پھاڑ کر چلایا جیسے اس کی عورت نے اس کا

کلیجہ نوچ لیا ہو۔

''بدمعاش کہیں کی' کیوں گئی تھی اس کے پاس' بول! تیرے باوا نے تجھے یہی سکھایا ہے۔ بول''

ذرا ہی دیر میں دوسری کوٹھریوں سے نوکر نکل کر اس کے دروازے پر جمع ہو گئے' نھتو اپنی عورت کو مار رہا تھا نا...... اور وہ تھی کہ چیخ چیخ کر کوٹھری سر پر اٹھائے ہوئے تھی۔

◆◆◆

دلدل

شفق کی لالی آہستہ آہستہ شام کے اندھیرے تلے دب کر دم توڑتی چلی جا رہی تھی اور میں ایک کھرے پلنگ پر چت پڑی کھوئی کھوئی نظروں سے آسمان کی طرف تک رہی تھی جس کے گہرے سرمئی سائے میں بڑی بڑی چمگادڑیں اپنے لمبے لمبے کانوں کو جھلتی' شام کے بوجھل سناٹے میں دبی دبی سرسراہٹ پھیلاتی گہرے سرخ خون میں لتھڑے ہوئے افق کی طرف اڑتی چلی جا رہی تھیں۔ ایک دوسرے کے پیچھے'چوروں کی طرح گردنیں گھماتی' جیسے وہ کسی بہت اہم لیکن پوشیدہ کام کی غرض سے جا رہی ہوں۔

''ایک دو تین'' بے شمار چمگادڑوں کے گزرنے کے بعد مجھے'ان کو گننے کی سوجھی۔ یہاں تک کہ میں گنتے گنتے اکتا گئی۔ بس وہاں تو نکلتی ہی چلی آ رہی تھیں'ایک کے پیچھے دوسری جیسے میری نظروں سے پوشیدہ۔ مشرق کی طرف' جدھر سے ہر صبح کو چمکتا' دمکتا ہوا سورج جھانکتا ہے۔ بس وہیں کہیں جیسے ان چمگادڑوں کی کان تھی۔ جس میں سے وہ نکل نکل کر میری آنکھوں کے سامنے' مغرب کی گہری سرخی میں ڈوبتی چلی جا رہی تھیں۔ جب میری آنکھیں تھک تھک کر بار بار جھپکنے لگیں تو مجھے اپنے پپوٹوں کے نیچے مزے مزے کی کھٹک سی محسوس ہونے لگی جیسے میں نے دادی جان کی لمبوتری سرمے دانی کا سرمہ چوری سے اپنی آنکھوں میں چھپا لیا ہو۔ وہی سرمہ جسے دادی جان ''کوہ طور'' کا سرمہ بتا کر سات سات سلائیاں اپنی آنکھوں میں پھیرتیں۔ کہا کرتیں کہ ''میں نے اللہ میاں کا جلوہ آنکھوں سے لگا لیا۔ اب مجھ پر سات طبق روشن ہو گئے۔'' اور جیسے میں نے بھی ایک دن مارے شوق کے آنکھوں میں سات طبق دیکھنے کی کوشش کی تھی مگر اللہ! وہ اندھیرا اور کھٹک۔ کہ زمین کا اوپری طبق بھی نظر سے غائب ہو گیا تھا۔ بس اسی دن سے تو توبہ کر لی تھی۔ دادی جان کی سرمے دانی سے عشق نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اب پھر ویسی ہی کھٹک۔ میری آنکھیں جھپکتی ہی چلی جا رہی تھیں اور اب بڑی بڑی چمگادڑیں بھی فضول سی لگ رہی تھیں۔ بس ایک نامعلوم سی بیزاری اور الجھن مجھ سے لپٹنے لگی۔

''اٹھو تمہارا بستر لگا دوں۔'' اماں نے بیدردی سے میرا بازو پکڑ کر مجھے زمین پر کھڑا کر دیا۔ وہ کچھ ناراض سی دکھائی دے رہی تھیں۔ انہوں نے میرا بستر لگاتے ہوئے بگڑ بگڑ کر کہنا شروع کیا۔ ''سچ کہتی ہوں یہ سرکاری نوکری بھی بس دو کوڑی کی ہے' بندر کا بسیرا' آج یہاں کل وہاں۔ ہمارا بچوں کا ساتھ'اس اجاڑ جگہ تو اسکول بھی نہ ہوں گے کہ بچوں کی تعلیم جاری رہ سکے۔ اور پھر اسٹیشن سے چودہ

میل دور۔ کبھی جو وطن سے اچھی بری خبر آئے تو پہلے اسٹیشن تک پہنچنے کے لیے انگو کھنگو لاریوں کے غمزے سہو' گڑھے والی سڑک کے عشوے دیکھو اور پھر راستہ بھر ریت کے چھپاکے۔''

''ریت!'' جیسے مجھے قارون کا خزانہ مل گیا۔

اور پھر کچھ سوچتے ہوئے تپتی ہوئی ہتھیلیوں سے دونوں آنکھوں میں چھپی ہوئی ریت کو مل ڈالا اور پھر نم آلود ہتھیلیوں کو اپنی نیلے پھولوں والی پسندیدہ فراک سے رگڑ ڈالا' کھٹک کچھ دب گئی۔

میں پھر اپنے پلنگ پر لیٹ گئی۔ باجی' آپا' نمو اور تارا کھانے کے لیے آہستہ آہستہ کھسک رہے تھے۔ مگر مجھے ذرا سی بھی بھوک نہ تھی۔ نہ جانے کیوں؟

میں نے پھر آسمان کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ جس پر اب کئی روشن ستارے اس طرح کانپ رہے تھے جیسے چڑیا کے گھونسلے میں رکھے ہوئے ننھے ننھے بے بال و پر بچے۔ چمگادڑیں اب بھی ایک دوسرے کے پیچھے اڑتی چلی جا رہی تھیں۔ وہی چوروں کی طرح گردنیں گھماتی' مغرب کے گہرے اندھیرے میں ڈوبنے کے لیے۔ سونے کے کمروں میں کئی جھینگر ایک ہی ساتھ' ایک ہی سر میں بولنے لگے۔ قریب ہی کہیں کوئی کتا بھونکا تو آنگن کے ایک کونے میں بنے ہوئے غسل خانے میں مینڈک بھی ٹرانے لگا اور مجھ پر پھر وہی بیزاری چھانے لگی۔

''اللہ توبہ'' میں نے دل ہی دل میں ہو بہو دادی جان کی نقل اتاری۔ ''ناحق اپنی پرانی گوئیوں کو چھوڑنے پر خوش ہوئی تھی مگر یہ نئی جگہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔''

گھر میں اسباب کی اٹھا دھری اور لیٹنے بیٹھنے کے انتظامات نے میرے ذہن کو ایک اور تکلیف دہ احساس میں مبتلا کر دیا کہ اب تو یہاں رہنا ہی پڑے گا اور جانے کب تک کے لیے؟ پلکوں کے تیز جھپکوں نے میری آنکھوں کی کھٹک بڑھا دی۔ یہاں تک کہ مجھے اپنی آنکھیں بڑی افسردگی سے بھینچ لینا پڑیں۔ لیکن چند منٹ بعد محسوس ہوا کہ اور کچھ نہیں بس نیند آ رہی ہے۔

جب میری آنکھ کھلی تو سامنے کی سفید دیوار پر تیز چمکیلی دھوپ غیر محسوس طریقے پر نیچے کی طرف رینگ رہی تھی اور منڈیر پر ایک کوا بیٹھا اپنی لمبی چونچ دائیں بائیں گھما گھما کر مسلسل چیخے جا رہا تھا۔ کائیں' کائیں' کائیں۔ چند لمحے میری ساری توجہ اسی کی طرف رہی۔ لیکن جب وہ منڈیر پر دو چار بار پھدکنے کے بعد اڑ کر نجانے کہاں غائب ہو گیا تو مجھے پھر یاد آیا کہ یہ ایک نئی جگہ ہے اور اب یہاں نہ جانے کب تک رہنا پڑے گا۔

میں نے اچٹتی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ اماں اور ابا مع نوکروں کے بندھا ہوا اسباب نکال نکال کر خوشی خوشی مناسب جگہوں پر لگا رہے تھے۔ آپا باورچی خانے میں بیٹھی اپنا ریشمی بچرنگا دوپٹہ بار بار اس طرح سر پر ڈال رہی تھی کہ چھوٹا سا گھونگھٹ اس کی پیشانی پر جھک آتا اور پھر خود ہی ادھر ادھر دیکھ کر سرخ سی پڑ جاتی اور دوپٹہ سر سے ڈھلکا دیتی۔ کچھ دن پہلے آپا کی شادی کی بات بڑی بڑی مونچھوں والے ایک زمیندار کی طرف سے آئی تھی۔ لیکن اماں نے اپنے زانو پیٹ پیٹ کر ابا سے صاف کہہ دیا تھا کہ ''نہیں کروں گی اپنی بچی کی شادی' اس کھوسٹ سے' کیا میری بچی ابا کہہ کر پکارے گی اسے؟ ایسی جائیداد لے کر چاٹنا ہے ہمیں؟ اور پھر لونڈیا کی ابھی عمر ہی کیا ہے جو ابھی سے آفت مچ گئی۔ تیرہ برس کی جان' اپنے اچھے برے تک کا شعور نہیں۔ اس پر چلے ہیں اترا کر اس بڈھے سے بیاہنے۔'' اور جانے کیا کیا جھگڑے ہوئے کہ زمیندار صاحب کو اپنی گلابی کلف دار پگڑی اور لمبی لمبی مونچھیں سلامت لے کر جانا پڑا۔ مگر نہ جانے آپا کے دوپٹے کو کیا ہوا تھا کہ تنہائی میں گھونگھٹ ضرور بن جاتا۔ اس وقت بھی مجھے اس کی گھونگھٹ کچھ نرالی نہ لگی' لیکن آپا نے مجھے تاکتے ہوئے دیکھ لیا اور ایک دم گھبرا سی گئی۔

''لے اٹھ شاداں منی ناشتہ رکھا ہے تیرا'' وہ جلدی جلدی پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی اور پھر اپنا دوپٹہ بالکل گھونٹ کے انداز میں سر پر ڈال کر ناک بھوں سکیڑتے ہوئے اس طرح آدھے سر پر سرکایا جیسے سارا قصور کم بخت دوپٹے ہی کا ہو۔ مگر آپا تو ناحق ہی میرے سامنے اپنی صفائی پیش کر رہی تھی۔ مجھے تو اس وقت صرف اپنی بیزاری ہی ناپسند ہو رہی تھی۔ بس بار بار' اپنی بچھڑی ہوئی گوئیاں' سکھیاں آمنہ اور کنیز یاد آ رہی تھیں اور میں رونا چاہتی تھی۔ لیکن آنسو تو حلق میں پھندے بن کر گھونٹے ڈالتے تھے۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ اپنی جانگیا اتار کر پھینک دوں اور فراک اٹھا کر دانتوں میں دبائے دبائے اماں کے سامنے چلی جاؤں اور وہ مجھے ''سات برس کی لوتھی ابھی تک کپڑا چوسنے کی عادت نہ گئی'' کہہ کر پیٹ ڈالیں لیکن اماں کی مصروفیت اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ مجھے ان کا متوجہ کرنا دشوار معلوم ہوا اور میں جوں کی توں بھری بیٹھی رہی۔

ابا ایک کمرے میں کہہ رہے تھے ''بیگم! دراصل دیہاتوں ہی میں زندگی کا مزا ہے۔ خالص گھی' تازہ دودھ' کھلی ہوئی فضا اور صاف ہوا... اور پھر دیہاتوں کے باشندے بھی کس قدر معصوم ہوتے ہیں۔ شہر کے چھل بٹوں سے ناواقف' سرکاری لوگوں کی تو اتنی عزت کرتے ہیں جیسے...... جیسے دیوتاؤں کی۔ ہی ہی ہی'' اماں نے بھی اپنی کھنکتی ہوئی ہنسی سے ان کی ہاں میں ہاں ملائی اور میرے دل کا بوجھ پہلے سے کہیں زیادہ بھاری ہونے لگا۔

''ہوں! بڑا اچھا ہے دیہات'' میں بدبدائی۔

دادی جان سلیپریں گھسیٹتی اور اپنا دوپٹہ سنبھالتی جانے کس کام سے میرے قریب سے گزرنے لگیں اور پھر جیسے کام بھول کر واپس جھول پڑیں۔

''اری شدو! ابھی تک بستر پر پڑی ہے۔ اللہ توبہ! کیسی نحوست ہے اس گھر پر۔ کوئی بھی تو سورج نکلنے سے پہلے نہیں اٹھتا۔ سچ تو یہ ہے کہ کوئی اللہ رسول کا نام تو لیتا نہیں جو اپنی نیند خراب کی جائے۔ پھر اس گھر پر آفتیں نہ آئیں تو کیا ہو؟ اور کیوں ای شدو! کل تو نے ریل میں اکنی لے کر مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اب نماز پڑھا کروں گی پانچوں وقت کی۔ آج فجر کی نماز تیرے فرشتوں نے پڑھی ہو گی' کیوں؟ دادی نے اپنا کھردرا ہاتھ میرے سر پر اس زور سے رکھا کہ مجھے ہلکی سی چوٹ لگ گئی۔ چوٹ کا احساس ہونا تھا کہ تپتی ہوئی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب گئیں۔ حلق میں پڑے ہوئے پھندے ٹوٹے تو گلے میں خراش پیدا کرتی ہوئی چیخیں گھر بھر میں گونج اٹھیں۔ بس ایسا امنڈ امنڈ کر رونا آیا کہ ابا کی ڈانٹ ڈپٹ' اماں کی دھمکیاں اور دادی جان کا پیار دلاسہ سب بیکار گیا۔ بس میری ایک ہی رٹ جاری رہی۔ ''ہم تو اپنے گھر جائیں گے۔ ایں ایں''

''کم بخت! سات برس کی ہو نہ آئی ابھی تک ننھی کے منہ سے دودھ ہی ٹپکا آ رہا ہے۔ وہاں اس کی اماں کی قبر ہے نا؟ اماں نے دانت کچکچا کر کہا اور میرے کولہے پر ایک گھونسہ جڑ دیا۔

''چپ... چپ! اب آواز نہ نکلے۔'' ابا نے بھی کپیا کر میرے دونوں کان مل ڈالے۔ لیکن دادی نے اچانک اماں اور ابا کے خلاف یہ کہہ کر اعلان جنگ کر دیا کہ اپنے ہوش میں رہو ذرا' بڑے آئے بچے پالنے والے' یہی لکھا ہے تمہاری الماری بھری کتابوں میں کہ نہ بچے کی طبیعت دیکھو نہ حالت' بس کٹمس کئے جاؤ گے وہ بیچاری ویسے ہی رو رو کر ہلکان ہوئی جا رہی ہے۔'' دادی جان برابر اماں اور ابا کے خلاف گولہ باری کئے جا رہی تھیں۔

اماں اور ابا تن تنا کر میرے پاس سے چلے گئے۔ آپا خوفزدہ سی' باورچی خانے سے اٹھ کر میرے پلنگ کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ اس کا بچرنگا دوپٹہ ہوا میں لہریں لے رہا تھا اور مجھے اپنی ''ریں ریں'' خود بھی بڑی مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔

''شاداں! رانی بیٹا!'' آپا نے ہاتھ میرے سر پر بڑے پیار سے رکھ دیا اور میں نے پلنگ پر اینڈ کر اپنی ''ریں ریں'' کو ایک دم اونچے سروں پر چڑھا دیا اس نے آنکھیں جھپکا کر میرے بالوں میں اپنی نرم نرم انگلیوں سے کنگھی کرنا شروع کی تو میرا چڑچڑا پن حد کو پہنچ گیا۔

''ہٹ جاؤ آپا۔ نہیں تو ہم تمہاری شکایت کر دیں گے کہ تم گھونگھٹ......'' میں نے اپنا جملہ ناتمام چھوڑ کر اس کی انگلیاں مروڑ

ڈالیں اور وہ مار کھائی ہوئی کتیا کی طرح دھیرے دھیرے باورچی خانے میں چلی گئی۔ معاً میرے دل میں اس کے لیے ہمدردی کی ایک ننھی سی لہر ابھری جو دوسرے ہی لمحے میرے چڑچڑے پن اور ضد کی چٹانوں سے ٹکرا کر گم ہو گئی۔ دادی جان پھر میری طرف جھول گئیں۔

''روئے جا رہی ہے۔ کتنا تو کہہ لیا تو تیری خاطر ان دونوں کو۔ کان کے پردے پھٹے جا رہے ہیں۔ الٰہی توبہ!'' اور مجھے خیال آیا کہ دادی جان سراسر جھوٹ بول رہی ہیں۔ میں ہرگز اتنے زور سے نہیں رو رہی جتنے زور سے قوالیوں کے ریکارڈ چیختے ہیں اور جنہیں سن کر وہ گھنٹوں جھومتی رہتی ہیں۔

''لے کلوا'' انہوں نے کلوا پر گولہ دے ٹپکا۔ کھڑا منہ کیا دیکھ رہا ہے۔ یہ نہیں کہ باہر جا کر ذرا بہلا لائے۔

میں بھی روتے روتے کچھ تھک گئی تھی۔ اسی لیے بہلائے جانے اور دادی جان کی تعریف کو جی چاہنے لگا کہ بغیر الماری بھر کتابیں پڑھے میرے دل کی بات سمجھ گئیں۔

کلوا میرے اینٹھے بردے جسم کو بغل میں دبا کر باہر لے جانے لگا تو اچانک باہر سے باجی دوڑتی ہوئی آئی اور میری ٹانگوں سے لڑ گئی۔ اسے دیکھ کر میرا چڑچڑا پن دور ہو گیا اور میں سوچنے لگی کہ یہ صبح سے غائب کہاں تھی۔ باجی تعجب سے اپنی بڑی بڑی آنکھیں پھاڑ کر بولی۔ ''تمہیں بلانے جا رہی تھی میں' چلو باہر دیکھو تماشا ہے؟ اللہ قسم مزا آ جائے گا۔''

میں دھم سے زمین پر کود گئی اور اس کے ساتھ بھاگ کر باہر کے برآمدے میں آ گئی۔ وہاں تارا اور نمو پہلے ہی سے شور مچا رہے تھے۔ برآمدے سے ذرا فاصلے پر احاطے ہی میں ایک ننگی دھڑنگی عورت کھڑی خاک میں اٹے ہوئے چھوٹے چھوٹے بالوں کو بری طرح کھسوٹ رہی تھی اور اپنے بڑے بڑے زرد دانت نکالے غرا رہی تھی۔ لیکن نمو اور تارا تھے کہ زمین سے مٹی کے ڈھیلے اور کنکر اٹھا کر اس پر پھینکتے ہی چلے جا رہے تھے۔

''بھوتنی ہے یہ' تم بھی مارو' نہیں تو تمہی کو چبا جائے گی۔ ہاں بابا ہم نہیں جانتے۔'' نمو نے کس قدر خوف سے اپنی آنکھیں پھیلا کر بڑے وثوق سے کہا اور پھر ایک بڑا سا مٹی کا ڈھیلا اٹھا کر جو پھینکا تو سیدھا بھوتنی کے مٹکا جیسے پیٹ پر لگ کر چھری مٹی ہو گیا۔ بھوتنی نے زور سے چیخ کر اپنے دونوں ہاتھ پیٹ پر رکھ لیے اور پھر اپنی بانس جیسی پتلی پتلی ٹانگیں گھسیٹتی' ہمارے پھینکے ہوئے ڈھیلوں کی بارش میں جانے کدھر بہہ گئی۔

''بھگا دیا میں نے اس بھوتنی کو۔'' نمو اکڑ کر بولا۔ ''نہیں تو سب کو ہڑپ کر جاتی۔ دیکھا تھا اس کا پیٹ' کتنا بڑا تھا؟'' وہ پورے

جوان مرد کی طرح ہم تینوں بہنوں پر اپنا رعب جما رہا تھا۔

''ہاں بھیا! اور وہ کیسے دانت نکال کر غرا رہی تھی جیسے بلیاں لڑ رہی ہوں۔ بھئی اللہ توبہ! بالکل ننگی بھی تو تھی۔'' تارا جلدی جلدی آنکھیں جھپکا کر بولی۔ ''اور باجی! بھوتنیوں کو شرم نہیں آتی؟'' وہ ذرا شرما کر پوچھنے لگی اور باجی نے ناک بھوں چڑھا کر کہا۔ ''لو بھئی! وہ تو بھوتنی ہے اور بھوتنیاں کپڑے پہن ہی کیسے سکتی ہیں؟ کیوں ہے نا شدو؟'' باجی نے مجھ سے بھی تائید کرانا چاہی لیکن میں تو جیسے سہم کر رہ گئی تھی۔ جی چاہ رہا تھا کہ اسی وقت جا کر ابا سے کہوں کہ لو بھئی بڑا اچھا ہے آپ کا دیہات۔ اب بھوتنیاں کچا چبا جائیں گی سب کو۔ لیکن میں شرافت کے دباؤ میں رہتے ہوئے ابا سے اتنا ڈرتی تھی کہ ایک لفظ بھی نہ بول سکتی اور اس دن خواہ مخواہ شرافت سی مجھ پر چھا گئی۔ دن بھر کوشش کرنے کے باوجود کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑی۔ اور سارا دن بھوتنی کے خیال سے اپنے جسم میں خفیف سے کپکپی محسوس کرتی رہی۔ ذرا بھی اکیلی ہوتی تو ایسا لگتا جیسے پیچھے سے بھوتنی بڑھی چلی آ رہی ہے۔ وہی بڑا سا پیٹ اور پتلی پتلی ٹانگیں' جیسے فرخ آبادی تربوز میں دو پتلے پتلے سینٹھے کو ٹھونس دیئے گئے ہوں۔ میں مارے خوف کے اکیلے پلنگ پر بھی نہ لگتی۔ بس سب میں گھس گھس کر بیٹھتی اور دل ہی دل میں منتیں مانتی کہ ''اے اللہ میاں تو کچھ ایسا کر دے کہ ہم لوگ یہاں سے چلے جائیں۔ پھر میں دو پیسے کی کھٹیوں پر نیاز دلواؤں گی۔ نماز بھی پڑھوں گی پانچوں وقت اور تسبیح بھی پھرایا کروں گی اور اب شرارت سے دادی جان کے نماز پڑھتے میں سامنے سے بھی نہ نکلوں گی اور نہ کبھی کسی بات پر ضد کیا کروں گی۔ میرے اللہ میاں ایسا ہو جائے تو۔''

میری کئی دن کی دعائیں اتنی طویل ہو گئیں کہ الجھ کر رہ گئیں اور میں اکتا گئی دعائیں کرتے کرتے۔

ایک ہفتہ گزر گیا اور کوئی ایسی صورت پیدا نہ ہوئی کہ ہم وہاں سے چلے جاتے اور نہ پھر بھوتنی ہی دکھائی دی۔ جب اللہ میاں کا وہ سہارا جو انسان اور حیوان کے درمیان اٹکا رہتا ہے' ہاتھ نہ آیا تو اپنی حالت پر آپ ہی مطمئن ہو گئی۔ یہاں تک کہ میں نے اس نئی جگہ کو پرانا کرنے کی ٹھانی۔ نمو اور باجی کے ساتھ ریتلی زمین کو اپنے پیروں سے خوب خوب روندا۔ قدموں کے نیچے کھس کھس کرتی ہوئی ریت کو جی بھر کر اڑایا۔ سیاہ کھپریلوں کی چھتوں والے' گوبر سے لپے پتے کچے مکانوں میں جھانکا جو ریتلی زمین پر اس بے ترتیبی سے بنے ہوئے تھے جیسے کسی بڑے بھاری دیو نے آپنی آسمان برابر جھولی میں سے مٹھی بھر ان مکانوں کی نکال کر فضا میں اچھال دی ہو اور چاول کے دانوں کی طرح بکھر گئے ہوں۔ بھری دوپہروں میں جب اماں اور ابا گرم ہوا اور دھوپ سے بچنے کی ہدایت کر کے اپنے کمرے میں گھس جاتے اور دادی تاریک کمرے میں پنکھا جھلتے اور آنکھیں جھپکاتے اونگھ جاتیں تو میں نمو اور باجی کے ساتھ ننگے پاؤں باہر نکل کر ننھے ننھے بگولوں کی رست و خیز کا تماشا دیکھتی اور بھنتی ہوئی ریت پر تلوے جمانے کی کوشش کرتی۔

کھجور کے لیے تڑنگے درختوں کو دیوانہ وار جھومتے دیکھ کر ان پر گلہریوں کی طرح چڑھنے کی کوشش کرتی یا پھر نمو کے مشورے سے کنکر پھینک پھینک کر کھجوریں گرانے کی کوشش کرتی۔ اس دوران میں اگر کھجور کے درختوں کا مالک اپنی جھونپڑی سے گردن نکال کر ہمیں دیکھنے لگتا تو یہ کھیل زیادہ دلچسپ معلوم ہونے لگتا۔ لیکن جب وہ نہ دیکھتا تو اس مشغلے سے جلد ہی جی اکتا جاتا اور ہم نہر تک جانے کے لیے کسی دھچر دھچر چلتی ہوئی بیل گاڑی کا انتظار کرنے لگتے۔ تھوڑی دیر بعد کوئی نہ کوئی بیل گاڑی نظر آ ہی جاتی اور ہم سب بغیر کچھ کہے سنے اس کے پیچھے پیٹ کے بل لٹک جاتے۔ گاڑی والا بھی کھجوروں والے کی طرح ہماری زبردستی پر کچھ نہ کچھ کہتا۔ یہاں تک کہ ہم ہاتھ منہ دھونے اور چھینٹیں اڑانے کے لیے نہر پر پہنچ جاتے اور پھر نہر کے دونوں طرف پھیلے ہوئے کھیتوں میں سے جو چاہتے توڑ توڑ کر برباد کر دیتے۔ لیکن کاشتکار چوں تک نہ کرتے۔ بس بڑی بے بسی سے ہمیں ٹکر ٹکر دیکھ کر رہ جاتے۔ یہ رنگ دیکھ کر نمو کا تخریبی جذبہ بیدار ہو جاتا وہ خواہ مخواہ ہم دونوں بہنوں کے چٹکی لے کر یا دھکا دے کر اچھلتا کودتا کھیتوں کے اندر گھس جاتا اور پھر ہم دونوں کو بھی مجبوراً انتقام لینے کی غرض سے اس کے پیچھے دوڑنا پڑتا۔ تھک کر وہ ''ہوہو'' کرتا گھر کی طرف بھاگنے لگتا تو ہم بھی کھیتوں سے نکل کر اس کا تعاقب کرنے لگتے۔ لیکن گھر کے دروازے پر پہنچ کر ہم تینوں کا جوش یک لخت سرد پڑ جاتا اور ہم بغیر بدلہ چکائے چپکے چپکے اپنے کمرے میں جا کر لیٹ جاتے۔ جہاں دادی بدستور اونگھ رہی ہوتیں۔

باجی اپنی کٹیلی آنکھیں جھپکا جھپکا کر کہتی۔ ''بھئی! کتنے اچھے ہوتے ہیں دیہاتی! کتنے سیدھے جیسے جان ہی نہیں ان میں۔'' اور میں اور نمو خواہ مخواہ ہنسنے لگتے۔

شام ہونے سے پہلے ہم تینوں میں سے کوئی اماں یا دادی سے لڑ جھگڑ کر دو چار پیسے لے مرتا اور پھر میں یا نمو وہاں کے برائے نام بازار میں چلے جاتے۔ میلی کچیلی بھنکتی ہوئی چند دکانیں' کھپریلوں کی ٹوپیاں اوڑھے' اونچے اونچے بے ہنگم چبوتروں کی توندیں بڑھائے' چپ چاپ کھڑی ہوئی دکھائی دیتیں۔ اور چلم پیتے یا جسموں کی میل چھڑاتے ہوئے دکاندار یوں دکھائی دیتے جیسے انہیں نیند آئی جا رہی ہو۔ میں تو ہمیشہ سیدھی بھڑبونجے کی دکان پر رکتی۔ بھنے ہوئے چنوں مکئی کی کھیلوں کے لڈوؤں' گڑ کے موٹے موٹے سیوؤں اور چاول کی کھیلوں پر ایک نظر ڈالتی اور پھر عموماً گڑ کے سیو مانگتے مانگتے' چبوترے پر چڑھ کر دکان کی کسی نہ کسی چیز کو چھو دیتی۔ یہ دیکھ کر بھڑبھونجے کی پتلیاں مرتی ہوئی چنگاریوں کی طرح ایک لمحے کو چمک کر بجھ جاتیں۔ لیکن وہ مجھ سے کچھ بھی نہ کہتا اور نہ چھوت کی چیز ہی پھینکتا وہاں کے لوگ تو سچ مچ بڑے سیدھے تھے۔ سیو کا چرمراتا ہوا دونا' دونوں ہاتھوں میں دبائے' میں جلدی جلدی گھر کے دروازے تک پہنچتی۔ جہاں نمو اور باجی میرے منتظر ہوتے اور وہ ڈھیر بھر سیو' دیکھتے ہی دیکھتے کڑ کڑ کے نگل لئے جاتے۔ میں اس

دوران میں برابر ادھر ادھر دیکھتی جاتی کہ کہیں تارہ' کلوا یا گھر کی نئی باورچن تو نہیں آ رہی؟ جو اماں سے شکایت جڑ دے اور پھر اماں ہماری اچھی طرح گت کریں کہ یہ الم غلم کیوں ٹھونستے ہو مرجھکو!

دو ایک مہینے میں میرا جی وہاں لگ سا گیا تھا یا مجبوراً لگانا پڑ گیا تھا۔ اب نہ تو مجھے اپنی بچھڑی ہوئی گوئیاں یاد آتیں اور نہ رونے چڑچڑانے کا ہی دورہ پڑتا۔ بھوتنی کا خیال بھی ایک خواب سا ہو گیا۔ اب وہاں کی ہر چیز مجھے مانوس محسوس ہونے لگی۔ گھر' گھر سے باہر' ریت' کھجوریں' چگادڑیں اور اونگھتے ہوئے مٹی کے بت جیسے باشندے۔ ہر ایک میں گہری اپنائیت سی محسوس ہوتی' جیسے میں یہیں کے لیے پیدا ہوئی تھی اور ہمیشہ سے یہیں رہی تھی۔

لیکن ایک دن یہ دیکھ کر ابا بھی ہماری ہی طرح دوپہر کو گھومنے پھرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ میرا کھلا ہوا دل رات کے کنول کی طرح مسرتوں کو دباتے ہوئے سمٹ گیا۔ میں نے اپنا فیصلہ نمو اور باجی کو سنا دیا کہ بھئی اب دوپہر کو باہر نہیں نکلنا چاہیے۔ ورنہ ابا دیکھ کر پٹائی کریں گے۔

''مگر جناب!'' نمو فکرمندانہ لہجے میں بولا۔ ''یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ابا' بھگوتی کا دوپٹہ کیوں گھسیٹ رہے تھے کھجوروں کے جھنڈ میں؟ اور بھگوتی کے باپ نے ابا کو منع بھی کیا جبکہ وہ سامنے جھونپڑیا میں بیٹھا چلم پی رہا تھا؟ اگر بھگوتی کا دوپٹہ پھٹ جاتا تو دوسرا کہاں سے لاتی غریب؟''

''واہ جناب!'' باجی اپنی حیران آنکھیں اٹھا کر بولی۔ ''بھگوتی کا ابا ہمارے ابا کو منع کر سکتا تھا بھلا؟ اسے جیل میں بند کر کے سپاہی سے ہنٹر نہ لگواتے؟ دیکھا نہیں تھا اس دن۔ سونی کے میاں کو کیسا پٹوایا تھا سپاہی سے؟ داروغہ جی ہیں ہمارے ابا' ہاں۔''

''کون سونی؟'' میں دماغ پر زور دیتے ہوئے بڑبڑائی۔

''ارے وہی چمارن! جو گیہوں پھٹکنے آئی تھی نا ایک دن؟ ارے وہی کالا بھنورا سی' خوب مٹک مٹک کر چلتی تھی۔'' باجی میرے حافظہ پر جھنجلا کر بولی اور مجھے وہ سونی یاد آ گئی۔ پکی جامنوں سے کچھ ہلکی رنگت' تیکھا نقشہ اور سانچے میں ڈھلا ہوا جسم' اس دن ابا گیہوں میں رہ جانے والی کوڑا کرکٹ سے پیدا ہونے والی خوفناک بیماریوں کا بار بار تذکرہ کرتے رہے اور رہ رہ کر چھنے چھنے گیہوں خود جانچتے رہے۔ مگر اماں' جیسے ابا کی باتوں پر کان دھرے بغیر ناراض سی ادھر ادھر پھرتی رہیں۔ ''تو پھر اب شام کو نکلا کریں گے گھومنے' بس! مجبوراً ہم نے قناعت کا ووٹ پاس کر دیا۔

لیکن میرا جی پھر رونے کو چاہنے لگا۔ اول تو دن بھر گھر میں بند رہنا پھر اماں کا آٹھواں پہر کا غصہ۔ جانے کیوں اماں پہلی جیسی نہ

رہی تھیں۔ بس بات بات پر ہم سب کو کوستی اور کوئتی رہتیں۔ یہ تو خیر تھا ہی لیکن جیسے ایک دن تو مجھ پر آسمان ٹوٹ پڑا۔ اس دن باجی سے میری جنگ تھی۔ اس لیے میں اور نمو نے سوچا کہ باجی کو جلانے کے لیے گھومنے چلا جائے اور ہم دونوں بازار کی طرف چل پڑے۔

نمو بولا ''آج ذرا اور آگے چلنا چاہیے' دیکھیں یہ سڑک کہاں ختم ہوتی ہے۔ اور ہم دھول اڑاتے آگے نکل گئے۔ کافی دور چلنے کے بعد ایک لمبا چوڑا' اونچا سا دروازہ نظر آیا۔ جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا ننھی ننھی لکھوری اینٹیں' جھڑے ہوئے پلستر میں سے دانت نکوسے بڑی عجیب سی نظر آ رہی تھیں۔ جیسے وہ دروازہ اپنی حالت پر ہنس رہا ہو۔ ہم دونوں رک گئے اور منہ اٹھا اٹھا کر اسے دیکھنے لگے۔

نمو بولا ''اتنا اونچا دروازہ کس نے بنوایا ہوگا؟''

''کسی راجہ نے بنوایا ہوگا۔ نہیں تو اور کس کی ہمت ہے؟'' میں نے بڑے وثوق سے جواب دیا۔

''بھلا کس لیے بنوایا ہوگا یہ؟''

''راجہ لوگ کوئی چیز بنواتے ہیں تو رعایا کو یہ دکھانے کے لیے کہ ہم ایسی ایسی چیزیں بھی بنوا سکتے ہیں تم لوگ کیا بنواؤ گے؟ دیکھو جیسے تاج محل ہے نا'' میں شاید کوئی بڑا ٹیڑھا مسئلہ بیان کرنا چاہتی تھی۔

''وہ دیکھو چھت میں'' نمو کی چیخ اچانک ماحول کی ویرانی اور سناٹے میں گونجی اور میں نے دیکھا کہ بہت سی چمگادڑیں' سر کے بل چھت سے اس طرح لٹکی ہوئی تھیں جیسے باورچی خانے کی چھت پر مکڑی کے بھاری بھاری جالے جھول رہے ہوں بیچارگی اور بے بسی سے۔ معاً مجھے وہ پہلی شام یاد آ گئی جب چمگادڑوں کی ڈاروں نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ آخر یہ آتی کہاں سے ہیں؟ میں انہیں اور قریب سے دیکھنے کے شوق میں دروازے کے قریب سرک آئی۔

''ہے... ایھ... رے'' دھیرے کراہنے کی آواز سنی اور میں نے مڑ کر دیکھا تو دروازے کے پہلو میں بنی ہوئی نیم تاریک سہ دری میں سرخ سرخ زمین پر وہی بھوتنی پڑی ایڑیاں رگڑ رہی تھی اور اس کے سینے پر سرخ گوشت کا ایک لوتھڑا پڑا تھا۔

''بھوتنی! بھاگ نمو!'' میں بگٹٹ بھاگی اور میرے پیچھے نمو۔

ہم دونوں نے گھر پہنچ کر ہی دم لیا۔ رات کو میں نے اور نمو نے بڑی دیر تک باجی سے خطرے سے نکل آنے پر چپکے چپکے باتیں کیں۔ اس ڈر سے کہ کہیں کسی اور نے سن لیا تو ابا سے شکایت ہوگی اور پھر ابا واقعی ٹانگ توڑ ہی نہ دیں جیسے کہ وہ کئی بار جتا بھی چکے تھے۔

''بس جناب! اب ہم لوگ قطعی باہر نہیں نکلیں گے۔'' نمو نے افسردگی سے انگلیاں چٹخاتے ہوئے کہا۔ اور ہم دونوں بہنوں نے

سچے دل سے عہد کر لیا کہ چاہے کچھ ہو جائے۔ اب باہر نہیں نکلیں گی۔ کیونکہ اب ہمیں بھوتنی نے اچھی طرح پہچان لیا ہے۔

''واہ'' باجی نے اپنی کٹیلی آنکھیں پھیلا کر کہا۔ ''اگر بھوتنی چاہے تو گھر میں بھی آ سکتی ہے۔ اسے روک ہی کون سکتا ہے؟'' یہ سن کر میں تو بڑی فکر مند ہو گئی اور پھر اللہ میاں کا سہارا پکڑا۔ ''اے اللہ میاں! اے میرے اللہ میاں!'' مگر اللہ میاں نے اب کے بھی مجھے نحوست اور خوف کی دلدل سے باہر نکالنے کا کوئی انتظام نہ کیا بلکہ اس دلدل میں اور بھی دھنسا دیا۔

اس واقعے کے تیسرے دن بعد صبح ہی صبح جو بستر سے سر اٹھایا تو سامنے بھوتنی نظر آ گئی۔ وہ ڈیوڑھی کے قریب اپنے ننھے بوے کو سینے سے دبوچے کھڑی تھی۔ اب اس کا پیٹ جھولے کی طرح رانوں کو لٹک گیا تھا اور ٹانگیں اندھیرے میں گم ہوتی ہوئی شفق کی طرح ہو رہی تھیں۔ میں نے انتہائی خوفزدہ ہو کر دوبارہ چادر میں منہ چھپا لیا اور مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت چھا گئی۔ جیسے میں آسمان پر سے دھکیل دی گئی ہوں۔

اچانک باورچی خانے سے باورچن چنگھاڑی۔ نکل تو حرامجادی' تیرا ناس ہو۔ سیرے سیرے تیرے پیٹ ماں آگ لگ گئی۔ جا نھئی سے روٹی مانگ جو سال پاچھ تیرے بچہ جنوا دیت ہیں۔''

''اری چپ رہ بتولن!'' اماں کی آواز میں ہنسی تھی۔ ''ذرا اس سے کچھ پوچھنے دے۔''

''اے بی بی کا پوچھت ہو اس سے' یہ کچھ ٹھیک ناہیں بتا سکت۔ اس کے دماکھ ناہیں۔'' بتولن نرم پڑ کر بولی اور مجھے ایک نئی بات معلوم ہوئی کہ بھوتنیوں کی دماغ بھی نہیں ہوتا۔

''کیوں ری چڑیل' اس بچے کا باپ کون ہے۔'' اماں نے کریدنا شروع کیا اور میں نے چادر میں سے منہ نکال کر دیکھا کہ کہیں بھوتنی اماں کو کھانے کے لیے تو نہیں بڑھ رہی۔

''ہم کا جانت ہے؟'' بھوتنی بڑبڑائی۔ ''ہوئیں چمگدریں پچاسن۔ ہم کا گنت ہیں۔'' (ہم کو کیا معلوم' چمگادڑیں ہوں گی پچاسوں' ہم کیا گنتے ہیں)

میرے دماغ میں جیسے ٹھک سے کوئی چیز لگی۔ اماں زور سے ہنسیں اور پھر ایک دم رنجیدہ ہو گئیں۔ انہوں نے بھوتنی کی طرف بڑے رحم سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بتولن اسے روٹی دے کر باہر بھگا دو ورنہ بچے جاگیں گے تو اسے دیکھ کر جانے کیا سوچیں گے؟''

بھوتنی روٹی لے کر اپنی لمبی لمبی ٹانگیں اچھالتی باہر بھاگ گئی۔

''ارے بی بی' یہ ہمیشہ کی دماکھ چلی ہے۔ پچیس برسیں بھئیں۔ سال پاچھو ایک بچہ جن دیت ہے۔''

’’بچے کہاں ہیں سب؟‘‘ اماں نے پوچھا۔

’’کھود ہی گردن مروڑ دیت ہیں۔ ارے بی بی! منش (مرد) کی جات ہوت ہے بڑی‘‘ بتولن نے جل کر ایک سڑی سی گالی بکی اور میں بلبلا کر اٹھ بیٹھی۔

’’اماں... آں‘ بھوتنی آئی تھی... آں‘‘ میں رونے کے قریب ہو رہی تھی۔

’’ہونہہ! دم نہ نکلے تمہارا‘‘ اماں نے چکچا کر کہا۔ ’’وہ بیچاری تمہیں کھا نہیں جائے گی۔‘‘ اور میں سخت حیران ہوئی کہ آخر اماں کو بھوتنی پر اس قدر رحم کیوں آنے لگا۔

شام کو میں اپنے پلنگ پر چت پڑی آسمان کو گھور رہی تھی۔ مغرب میں سورج سرخ پڑتا جا رہا تھا اور ساتھ ہی بادلوں کے سفید سفید بہتے ہوئے ٹکڑے افق کو چھوتے ہوئے سرخ ہوتے جا رہے تھے۔ آج مجھے چمگادڑیں دیکھنے کا بڑا چاؤ تھا اور صبح ہی سے نمو اور باجی نے وعدہ کیا تھا کہ آج شام کو انہیں بھوتنی کے بچے کے ابا ایک کرسی پر خاموش بیٹھے اپنی مونچھوں میں بل دے رہے تھے اور اماں میرے بائیں گھٹنے پر ٹھوڑی رکھے ابا کو دیکھے جا رہی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد چمگادڑوں کی ایک قطار گردنیں گھماتی‘ اپنے پنکھ ہاتھی کے کانوں کی طرح جھلتی‘ مغرب کی طرف بڑھی اور میں بے ساختہ تالیاں بجا بجا کر چلانے لگی۔

’’وہ دیکھو وہ چمگادڑیں‘ بھوتنی کے بچوں کے ابا‘ اتنے بہت سے ابا‘‘

نمو تارا اور باجی کی پلکیں مارے حیرت کے پپوٹوں سے چمٹ گئیں اور آپا اپنا آنچل منہ میں ٹھونس کر مارے ہنسی کے کیرم بورڈ پر جھک گئیں۔ ابا اپنی مونچھیں مروڑتے مروڑتے رک کر اماں کی طرف کڑی نظروں سے دیکھنے لگے۔

اماں جلے کٹے انداز میں بولیں۔ ’’ارے آپ گھور کیوں رہے ہیں؟ وہ تو اس پگلی کے بچے کے لیے کہہ رہی ہے جس کے متعلق میں نے آپ کو دوپہر میں بتایا تھا۔ سچ تو ہے چمگادڑوں ہی کی اولاد تو ہے‘ ڈرپوک چوروں کی پنچایتی اولاد۔‘‘

’’کیا بکواس ہے؟‘‘ ابا نے آہستہ سے انہیں ڈانٹا اور ان کی آنکھوں سی چنگاریاں سی جھڑتی محسوس ہوئیں۔ میں ڈر کر پلنگ پر سمٹ گئی۔

’’ارے! سچ کہنے میں ہرج ہی کیا ہے؟ اماں نے بھی آنکھیں تریریں‘‘ بچی نے سونی اور بھگوتی کے ہونے والے بچوں کا تو پتہ نہیں لگا لیا ہے جو چوکھے دیوتاؤں کا غضب نازل ہونے لگا۔

’’بدتمیز عورت‘‘ ابا کی مونچھیں ہونٹوں کی جنبش سے مضحکہ خیز طریقے پر تھر کیں۔ وہ اٹھے اور اماں کا ہاتھ بیدردی سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے کمرے میں لے گئے۔

’’چمگادڑوں کے بچے! چمگادڑیں اندھیرا ہوتے ہی چوروں کی طرح‘ ایک ہی طرف اڑتی چلی جاتی ہیں۔ اور بھوتنی ایک ویران جگہ‘ سرخ سرخ زمین پر لیٹ کر ایڑیاں رگڑتی ہے۔ پھر وہ سونی اور بھگوتی‘ ہونے والے بچے‘ دیوتا‘ دن دیہاڑے ابا دوپٹے گھسیٹتے ہیں۔ اور پھر ابا خواہ مخواہ اماں کا ہاتھ بیدردی سے کھینچتے ہوئے کمرے میں لے جاتے ہیں۔ آخر کیوں؟ بھئی اللہ‘ یہ کیا ہے؟ میں خوف اور نحوست کی دلدل میں سر تک دھنس گئی۔

◆◆◆

کمینی

شام کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں

''نکل حرام زادی! نکل تو کمینی'' بھاری اور کراری آوازوں کے ساتھ ساتھ شرم وحیا کے بوجھ سے دبی ہوئی مہین مہین آوازیں اسی ایک جملے کو اونچے نیچے سروں میں رٹتے رٹتے بھیانک ہو گئیں۔ گھر کے اندر سے اس جملے کے علاوہ دھمک دھیا کا شور بھی اٹھ رہا تھا۔ جیسے وہاں سب کے سب مل کر بڑھتی ہوئی سردی کے استقبال کے لیے موٹے موٹے لحافوں سے گرد جھاڑ رہے ہوں۔ لیکن اصل بات یہ نہ تھی۔ کیونکہ تھوڑی ہی دیر بعد اندھیری ڈیوڑھی کے پاٹوں پاٹ کھلے ہوئے دروازے میں سے بچے کھچے کپڑوں میں لپٹا ہوا کوئی دھم سے پکی گلی میں آ گرا تو چاندی کی موٹی موٹی جھانجیں اور چوڑیاں بڑی دلچسپ آواز میں بج اٹھیں۔ بھلا اس محلے میں سوائے چھٹکی کے کس کے زیوریوں بیچ گلی میں بج سکتے ہیں؟

دھڑاک دھڑاک کر کے کھلے دروازے کے دونوں پٹ بھنچ گئے۔ گلی میں دو رویہ مکانوں کے کچھ دروازے کھلے۔ چھوٹے بڑے چہرے جھانکے' آنکھوں میں حقارت آمیز ہمدردی جھلکی اور پھر کچھ نہیں۔

اچھا ہوا' اپنی اوقات بھول گئی تھی کمینی۔ بڑی آئی تھی کہیں کی بیگم بن کر گھر میں براجنے۔ پر یہ نہیں جانتی تھی کہ بیگمیں پیدا ہوتی ہیں بنا نہیں کرتیں۔ اور یہ پیدا بھی ہوتی ہیں تو صرف اونچے گھرانوں میں۔ مطلب یہ کہ جو ذات پات میں اونچے ہوں اور جن کے ہاں چاندی کے سکے چمکتے کھنکتے ہیں۔ یہ نہیں کہ ذات کے تو فقیر جنہیں اللہ میاں نے دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانے کو دنیا میں اتارا ہو وہاں بیگمیں پیدا ہونے لگیں۔ ابھی چند سال پہلے کی تو بات ہے کہ انہیں گلیوں میں یہی چھٹکی مزے سے۔ ''اللہ بھلا کرے'' کی روٹی کھاتی تھی۔ باوا نے اس ایک صدا پر اتنا پایا کہ مرتے وقت قصبے کے قبرستان کے قریب اپنی زمین چھوڑی اور اس پر کھنچی ہوئی کچی چہار دیواری۔ بھلا کوئی ایم اے' بی اے تو اس زمانے میں تمام عمر نوکری بجانے کے بعد اپنی قبر بنوانے کے لیے دو گز زمین خرید چھوڑے؟ مگر جب کسی کی شامت آنا ہوتی ہے تو عقل پر پتھر پڑ جاتے ہیں۔ یہی ہوا چھٹکی کے ساتھ کہ باوا کی آنکھ بند ہوتے ہی ''چھٹکی'' سے ''بڑکی'' بننے کا خبط ہو گیا۔ وہی بات کہ جب چیونٹی کی موت آتی ہے تو اس کے پر نکل آتے ہیں۔ نہ جانے کم بخت کے

گول مول سر میں یہ بات کدھر سے گھس گئی کہ بھیک مانگنا اچھا نہیں۔ فرض کیا کہ اکثر لوگ بجائے بھیک دینے کے اسے جھڑک دیتے یا کوئی اور حرکت کرتے' تو اس میں برا ماننے کی کونسی بات تھی؟ جب پیشہ ہی ایسا ٹھہرا تو اتنی اونچی ناک لے کر چلنے سے فائدہ۔ اور رہا جمن کا۔ وہی جمن بھکاری۔ اگر اس پر جان دیتا تھا تو اس میں گھبرانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ بیچارا تو جب دیکھو اپنی سدا بہار پھڑیوں سے بھرا ہوا لمبا سا جسم لہراتا صدقے ہوا جا رہا ہے۔

''اری دیکھ نا چھٹکی!'' وہ گھگھیا کر کہتا۔ ''اکیلی رہتی ہے گھر پر' تجھے ڈر نہیں لگتا۔ سالا جمانہ کھراب ہے جو کبھی کوئی آڑی بیڑی پڑ گئی تو تیرے ابا کی روح گور میں کلبلائے گی تو میرے ساتھ رہ۔ میں سالی عیدن کو چٹیا سے پکڑ کر نکال دوں گا اپنے گھر سے جو اس نے بیاہتا ہونے کے گرور میں کبھی تجھ سے جرا بھی چیں چپڑ کی تو بلا کھٹکے آ کے رہ۔ مجے میں ہم اکٹھے بھیک مانگنے نکلا کریں گے۔ پھر تو کوئی تجھے نجر بھر کر دیکھ جائے' اللہ کسم چھٹکی! یوں آنکھیں نکال لوں یوں'' اور یہ کہتے کہتے جمن کا ہاتھ جس پر یہاں سے وہاں تک سرخ سرخ پھڑیاں سلسلہ کوہ کے مانند پٹی پڑی تھیں۔ بڑھ کر کچھ ایسی ''آڑی بیڑی'' ڈالتا کہ چھٹکی کے چھکے چھوٹ جاتے اور پھر وہ دل ہی دل میں ہزاروں قسمیں کھاتی کہ ''اب جو گھر سے قدم نکالوں تو کوڑھی ہو جاؤں' اللہ کرے' بھلے ہی مر جاؤں بے دانہ پانی گھر میں بند پڑے پڑے۔'' اب بھلا کوئی سوچے کہ کم بخت بیٹھ جاتی جمن کے گھر تو کیا برا تھا۔ نہیں تو کیا اسے کوئی دھلا دھلایا جوان مل جاتا برادری میں؟ مزے سے باپ دادا کے پیشے سے کھاتی اور جمن کو بھی کھلاتی لیکن وہاں تو بڑکی بننے کی سوجھ رہی تھی۔ دو دن اپنے گھر میں بند پڑی رہتی۔ جمن دن بھر میں بیسیوں پھیرے کرتا اور آخر کواڑ پیٹ کر چلا جاتا۔ ایسی تو خوبصورت بھی نہ تھی کم بخت بس ذرا جوانی تھی۔ کھلتی ہوئی کلی مگر گھورے کی۔ اس پر یہ دماغ' جمن اچھا نہیں' بھیک مانگنا اچھا نہیں۔ تو پھر اچھا کیا تھا؟ اے لو! بس ایک دن جمن کے کان میں پڑی کہ چھٹکی نے چار روپیہ مہینہ اور کھانے کپڑے پر ایک کھاتے پیتے گھرانے میں دن رات کی نوکری کر لی ہے۔ بس غریب جمن منہ پیٹ کر رہ گیا۔ غصہ اتنا ضبط کیا کہ رات بھر میں اس کے جسم کی ساری پھڑیاں خون پیپ سے چپچپا گئیں۔ مگر چھٹکی تو ایسی خوش تھی کہ جیسے سارے جہان کی دولت پا گئی ہو۔ بات بات پر دانت نکلے پڑتے تھے اور زمین پر تو جیسے قدم ہی رکھ ہی نہ رہی تھی۔ صبح سے لے کر شام تک کولہو کے بیل کی طرح کام میں جٹی رہتی۔ رات کو کہیں گیارہ بجے تک اپنے کھٹولے پر جانے کی نوبت آتی اور پھر صبح اذان کے وقت سے وہی دھندا۔ سانس لینے کی بھی مہلت نہ ملتی۔ اس پر بھی کم بخت کی خوشی کا یہ عالم کہ چلو در در صدا لگانے سے تو یہی اچھا ہے۔ اب گھر کی بیبیوں کے علاوہ تو کسی کی کڑوی کسیلی سننے کی نوبت نہیں آتی اور سب سے بڑی بات تو یہ کہ اس گٹھلی دار جمن کے چونچلوں سے جان بچی' مزے سے گھر میں بیٹھی ہوں۔ اب جمن کی ہمت نہیں کہ ادھر جھانک بھی لے۔''

چند مہینے تو وہ اسی خوشی کے چکر میں پھنس کر خود کو بھی بھولی رہی لیکن پھر ایک کچھی بوجھی چبھن نے اسے خطرناک طریقے پر ستانا شروع کر دیا۔ جب وہ بھیک مانگا کرتی تھی تو "اللہ بھلا کرے گا ایک روٹی یا ایک پیسہ مل جائے" کی صدا لگاتے ہی اکثر گھروں سے اور چیز بھی بلا مانگے ہی مل جایا کرتی تھی۔ وہ چیز جس سے کبھی تو وہ نفرت کرتی اور کبھی محبت۔ سنسان گلیوں کی بیٹھکوں میں لیٹے بیٹھے یا حقے سے شوق فرماتے ہوئے کوئی بزرگوار اسے دیکھ کر مارے شفقت کے لچکچا کر اپنی ایک آنکھ میچتے' عاشقانہ تبسم سے اپنی باچھیں نوازتے یا اس کی ہتھیلی پر پیسہ رکھتے ہوئے اس کے گول مول ہاتھ کو سہلا دیتے تو اسے ایسا لگتا جیسے کہ اس کے تلوؤں کے نیچے آتش بازی کے دو انار رکھے چھوٹ رہے ہیں۔ سرر سرر سرر' اور چنگاریاں ہیں کہ سیدھی دماغ میں جا کر بجھ رہی ہیں۔ اس موقع پر اس کا جی چاہتا کہ دو چار ننگی ننگی گالیاں دے کر پسیجا ہوا پیسہ تاک کر اس طرح مارے کہ میچی ہوئی آنکھ کا دیدہ خون ہو کر بہہ جائے اور پھر ان کی ایک آنکھ ہمیشہ کے لیے میچ جائے۔ مزا آ جائے جو میاں جی اپنی میچی ہوئی آنکھ کی وجہ سے اپنی بہنوں اور بیٹیوں کے لیے بھی ایک برا سا اشارہ بن کر رہ جائیں۔ لیکن وہ کچھ کر نہ پاتی۔ سوائے اپنے پیشے سے نفرت کرنے کے۔ برعکس اس کے جب کسی گھر سے اس کی صدا پر کوئی لڑکا نکل کر یونہی آنکھیں مٹکا دیتا تو چھٹکی کو ایسا محسوس ہوتا کہ سر میں ایک میٹھی میٹھی گھمری سما گئی ہے۔ ہلکا ہلکا بخار ہو گیا ہے اور ٹانگیں ہیں کہ مفلوج ہوئی جا رہی ہیں۔ بس جی چاہتا کہ دھڑام سے زمین پر گر پڑے اور آنکھیں بند کر کے اس گھمری کے مزے لیے جائے۔ پر نوبت یہاں تک پہنچنے ہی نہ پاتی۔ کیونکہ ایک آنکھ میچنے والے بزرگوار اپنی دوسری کھلی ہوئی آنکھ سے اپنے بال بچوں اور اڑوس پڑوس والوں کی نگرانی کرتے ہیں۔

"اوری فقیرنی... دوسرا دروازہ دیکھ" کسی نہ کسی طرف سے یہ پھٹکار بلغم آلود دھنستی ہوئی آواز میں اس طرح پڑتی کہ اس کی گھمری تو ہوا ہو جاتی۔ لیکن غصہ بھبک اٹھتا۔

"کیا برا پیشہ ہے۔" وہ بڑی نفرت سے اپنے پیشے کو چن چن کر گالیاں دیتی۔ یہاں تک کہ اس نے نوکری بھی کر لی اس کارن' مگر اب پھر کیا مصیبت ہے۔

"چاہے کچھ ہو جائے' اب بھیگ مانگنے سے تو رہی۔ دوسرے وہ جمن پھر پیچھا پکڑے گا۔"

وہ بہت دیر الجھنے کے باوجود ہمیشہ یہی فیصلہ چپکے سے صادر کر دیا کرتی۔ لیکن یہ شیطانی خواہشیں تو بس بالکل سیولائڈ کا جاپانی ہوا ہوتی ہیں۔ وہی ہوا جس کے پیندے میں رانگے کی ٹکلی چپکی ہوتی ہے اور جسے ضدی بچے لٹانے کی لاکھ کوشش کرتے ہیں مگر وہ جھٹ بیٹھ جاتا ہے۔ کیا کیا جائے۔ اس کی تو بناوٹ ہی ایسی ہوتی ہے۔ پھر چھٹکی کی تو یہ حالت تھی کہ میٹھا میٹھا ہپ' کڑوا کڑوا تھو۔ بھیک مانگنا

برا' جمن برا' آنکھ میچنے والے برے۔ نوکری کرنا اچھا' گھر میں بیٹھنا اچھا۔ اب ایک اور ایسی اچھائی کی چاہت ہوئی جو جمن کی برائی کے مقابلے پر خم ٹھونک کر آ جائے' لیکن اس کے لیے تو چراغ رخ زیبا چاہیے کہ دیکھ کر چوندھیا جائے اچھا بھلا اور یہاں چھائی تھی سنولائی ہوئی بدلی جس کے سائے میں چیچک کے کئی گہرے کھڈ اور موٹے موٹے مہاسوں کے ٹیلے۔ مگر یہ سب برائیاں بھی دب جایا کرتی ہیں دبائے سے چھٹکی جیسی گلی گلی گھومنے والی' دنیا کو دیکھ ہی دیکھ کر بہت تاڑ چکی تھی۔ بس اب گھر کے کام کاج کے مقابلے میں اپنی بھی فکر پڑ گئی۔ یا تو اٹھواروں کنگھی کرنے کا ہوش نہ تھا۔ موٹی موٹی جوئیں سارے سر میں بلبلاتی پھرتیں اور چھوٹی چھوٹی الجھی ہوئی لٹیں جو موٹے دوپٹے کے ذرا ادھر ادھر ہونے سے کانوں کے پیچھے سے یوں جھانکتیں جیسے موٹے موٹے چوہے اپنے بلوں سے نکلنے کا موقع تاک رہے ہوں۔ اب وہی لٹیں چلوؤں سرسوں کے تیل سے بھگو کر دن میں دو بار چوٹی میں جکڑی جاتیں۔ کپڑے جن میں پسینے اور سانسوں کی بو اس طرح بسی رہتی کہ دور ہی سے اچھے بھلے دماغ اڑنے لگیں' اب وہی جمعہ جمعہ نل کے نیچے بٹیوں صابن سے صاف کیے جاتے اور پھر چوڑی دار پاجامے کو پنڈلیوں پر کس کے اتنے ٹانکے دیتی کہ گھٹی ہوئی پنڈلیوں کا گوشت جیسے بوٹی بوٹی ہو کر ابل پڑتا۔ مالکن نے کچھ بھانپا تو باتوں ہی باتوں میں لتے بھی لیے چھٹکی کے۔ کیونکہ انہیں اپنے بوڑھے میاں کے جھپٹ لیے جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن چھٹکی نے نہایت بھولے پن سے اللہ رسول کی قسمیں کھا کر ان کے دل کا سارا میل دھو دیا اور چلتی رہی اپنے رخ پر۔ گھر کے مردوں میں سے جہاں کسی کی نظر باورچی خانے کی طرف اٹھی تو بس چھٹکی کی رگ رگ میں بجلی سمائی۔ نچلی بیٹھ ہی نہ پاتی۔ اگر ہنڈیا بھونتی ہوتی تو چمچہ اتنے زور سے چلاتی کہ ہاتھ کی بے تحاشہ حرکت سے دوپٹہ غریب سہم کر گلے سے لپٹنے لگتا۔ کوئی چیز اٹھانے دھرنے اٹھتی تو ایسے قدم رکھتی کہ دیکھنے والے کا دل دہلے تو دہلے زمین بھی ہل اٹھے۔ یا کچھ نہیں تو پلی ہوئی مرغیوں کو ہنکانے کے بہانے فقرے چست کرنے لگتی۔ اور کبھی گھر کے کتے ٹامی سے باتوں ہی باتوں میں پتے کی باتیں کہنے لگتی۔ بس باورچی خانہ کیا تھا کسی تالاب کا کنارہ۔ جس پر چھٹکی اپنی ڈور پھنسی سنبھالے مچھلی کا شکار کھیل رہی تھی۔ اپنے کانٹے میں جوانی کا چارہ پھنسائے۔ کئی ہوشیار مچھلیاں لپکیں کہ لاؤ چارہ صفائی سے اڑا جائیں۔ لیکن چھٹکی بھی کچی گولیاں نہیں کھیل رہی تھی۔ اسے تو ایسی موٹی مچھلی چاہیے تھی جو چارہ کھانے کے بعد ایسی پھنسے کہ وہ تمام عمر اس کا گوشت نوچ نوچ کر پیٹ بھرتی رہے۔ تو پھنسی ایک بیوقوف مچھلی اس کے کانٹے میں۔ معراج میاں۔ صاحب خانہ کے بھانجے' نک سک سے درست۔ لیکن مزاج کے کڑوے اور پرلے درجے کے ضدی اور کاہل۔ انہی عیبوں کی وجہ سے وہ سارے کنبے میں بدنام تھے۔ لوگ اپنی لڑکیاں ان سے بیاہنے کے نام کانوں پر ہاتھ رکھتے کہ نہ بابا! اپنی لونڈیا کو خون تھوڑی تھکوانا ہے جو معراجو کو بیاہ دیں۔" گھر میں بھی ان کی کوئی وقعت نہ تھی جسے دیکھو ان سے کھنچا ہی رہتا۔ لیکن

وہ تھے کہ سارے گھر کو جوتی کی نوک پر رکھے' باورچی خانے کے سامنے والے دالان میں چارپائی پر اوندھے پڑے ٹانگیں ہلایا کرتے۔ یا پھر دو پیسے روز پر کرائے کی لائی ہوں ناولیں پڑھا کرتے۔ لیکن جب پلے کوڑی نہ ہونے کی وجہ سے ناولیں نہ لا سکتے اور نہ سگریٹ ہی خرید سکتے تو تھوڑی بہت جماہیاں اور انگڑائیاں لینے کے بعد ان پر خودداری کا دورہ پڑ جاتا کہ جب تک وہ خود نہ دیں گے خرچ' میں بھی نہ مانگوں گا۔ یہ فیصلہ کر کے ان کی طبیعت ایسی موزوں ہوتی کہ مرغیوں' کتے' بچوں اور نوکروں کو جما جما کر میٹھی میٹھی گالیاں دینے لگتے۔ بس خاصی مزے سے بسر ہو رہی تھی کہ چھٹکی نے پچکارا دیا۔ معراجو میاں کے لیے چھٹکی سب کی نظر بچا کر بھنا ہوا گوشت اور گھی میں تر روٹیاں کیا رکھنے لگی اور وقت بے وقت اپنی تنخواہ میں سے روپیہ دو روپیہ سگریٹ پان کے خرچ کے لیے ان کی جیب میں کیا ڈالنے لگی کہ بس وہ اسی کے ہو رہے۔ بالکل اس منحوس کنوئیں کی طرح جس میں کوئی گندی چیز پڑی اور وہ ابلا۔

ایک دوپہر کو چھٹکی نے مالکن سے اپنے گھر کی دیکھ بھال کے لیے چھٹی لی اور چلتی بنی۔ اس کے بعد معراجو میاں کا دل گھر میں کیسے لگتا؟ بس دھلی ہوئی شیروانی پہنی بالوں میں تیل ڈالا اور اپنے ایک دوست سے ملنے چلے گئے۔ شام کو جب وہ دونوں لوٹ کر آئے تو خوب منہ رچائے' اور کسی سستی سی خوشبو میں بسے ہوئے۔

''رنڈی'' مالکن منہ بچکا کر نہ صرف اتنا ہی چپکے سے کہہ سکیں۔ لیکن دوسری صبح مالکن نے رات چھٹکی کے کھٹولے سے غائب ہونے پر جو باز پرس کی تو معراجو میاں نے ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کیا کہ ''انہوں نے کل چھٹکی سے نکاح کر لیا ہے'' ایک لمحے کے لیے جیسے سارا گھر حق دق رہ گیا۔ لو بھلا اتنا بھی ندیدہ پن کیا؟ مانا کہ کنبے کی لڑکی نہیں مل رہی تھی تو اس کا یہ مطلب تھوڑی تھا کہ کمینی کو سر چڑھا لیتے؟ اور پھر اگر ایسی ہی کوئی مجبوری تھی تو یونہی کام چلا لیتے' نکاح کی کیا ضرورت تھی؟ اب جو گھر والے بگڑے اور ذرا چھٹکی کے بال پکڑ کر دس پانچ ہاتھ مار دیے تو معراجو میاں' وہی معراجو میاں جو اپنے باپ کے مرنے کے بعد سے ماموں کی روٹیاں توڑ رہے تھے' مقابلے پر آ گئے۔ بوڑھے ماموں کو انکی لغزشوں کا طعنہ دیا اور کنبے بھر کی ڈھکی چھپی کھولنے پر اتر آئے۔ اللہ کی شان کہ ایک بھک منگی کی خاطر ایسا ایسا کہا کہ کتے کوے بھی گھن کھائیں۔ یوں ناک کٹانے کے بعد چھٹکی کو لے کر اسی گلی کے ایک چھوٹے سے مکان میں بس گئے۔ کنبے والے ایسے شخص کو منہ کیا لگتے۔ جس پر عورت کی جوانی کا جادو چل گیا ہو۔ بس موت و زندگی کے لیے انہیں چھوڑ دینے کا عہد کر کے بیٹھ رہے۔

اب وہی معراجو میاں تھے کہ جنہیں پڑے پڑے روٹی کھانے کا چسکا تھا' کمانے کی فکر کرنے لگے۔ نوکری تو خیر ڈھونڈے نہ ملی' کیونکہ خدا کی مہربانی سے انہوں نے کوئی ڈگری تو لی نہ تھی۔ بھلا کوئی معمولی پڑھے لکھے سے غلامی کیوں کروانے لگا؟ بس انہوں نے

چھٹکی کے سکھانے پڑھانے سے واشنگ کمپنی کھول لی۔ اس کے لیے چھٹکی نے اپنا گھر بیچ کر روپیہ ان کے ہاتھ پر رکھ دیا اور رفاقت جتانے کے مارے ایک سال تک گٹھڑیوں میلے کپڑے گھر کے نل تلے دھوتی رہی۔ یہاں تک کہ کام خوب چمک اٹھا۔ اب چھٹکی کے پوں بارہ تھے' وہی جو کبھی لتے لگائے بھیک مانگا کرتی تھی۔ اب گھر میں مہین ململ کی ساریاں باندھ کر گھومتی۔ چاہے کم بخت کو ساری باندھنے کی تمیز نہ ہو۔ ٹخنوں سے بالشت بھر اونچی۔ سامنے سے دیکھو تو ایسا معلوم ہو کہ بس ایک بچے کی صورت میں معراجو میاں کے کھرے خاندان پر کلنک کا ٹیکہ لگا کر رہے گی۔ مگر رذیل چھپتا نہیں۔ اب یہی کہ زیور بھی بنوایا تو وہی چاندی کا۔ موٹی موٹی جھانجھیں' گلے میں سیر بھر کا چندن ہار اور کلائیاں بھر بھر کڑے چوڑیاں۔ گھر میں جب اترا کر چلتی تو سارا محلہ جھانجھوں کی جھن جھن سے گونجتا۔

کبھی تو معراجو میاں کی طبیعت پر تھڑی تھڑی کرتے کہ جانے کیسے اسے بیوی کی حیثیت سے برداشت کرتے ہیں مگر معراجو میاں تو مارے خوشی کے اینڈتے پھرتے کہ چھٹکی جیسی عورت کسے نصیب ہو گی؟ وہی چڑیا والی کہانی کہ اس نے گھوڑے پر دانہ چگتے چگتے ایک ٹوٹا ہوا جھوٹا موتی پا لیا۔ بس چونچ میں دبا کر راجہ کے محل کے کلس پر بیٹھ کر کہنے لگی ''جو میرے پاس وہ راجہ کے پاس نہیں'' لو بھلا چھٹکی میں رکھا ہی کیا تھا؟ ''میاں کی خدمت کرنا' بیمار ہوں تو دن رات ایک کر دینا' رات گئے تک روزانہ پاؤں دبانا' کھانا پکانا' کپڑے سینا اور دکان کے کام میں بھی زیادہ سے زیادہ ہاتھ بٹانا' یا میاں کے بے پناہ غصے کی جھپٹ میں آ کر دوسرے تیسرے دن پٹ لینا اور منہ سے اف نہ کرنا۔ یہی تو سب ایک جال تھا جس میں اس نے معراجو میاں کو بری طرح پھانس رکھا تھا۔ بس یہی بات تو معراجو میاں کی سمجھ میں نہ آتی تھی' باقی تو ہر شخص اچھی طرح سمجھ رہا تھا اور اس لیے کڑھتا۔ لاکھ کنبے برادری کے لوگ انہیں چھوڑ چکے تھے لیکن آخر اپنے خون کے جوش کو کیسے دباتے کہ معراجو میاں کے کاروبار کا سارا نفع اپنے خاندان کی کسی لڑائی پر صرف ہونے کے بجائے چھٹکی کے سنگ لگ رہا تھا۔ ایک رذیل عورت کے۔ جس نے خود کو بنانے کے لیے ایک بنا بنایا خاندان بگاڑا تھا۔

ایک دن جو معراجو میاں کی حالت زار کا گھر میں تذکرہ ہوا تو معراجو کے ماموں کا دل بھر آیا اور پھر اس وقت تک بھرا رہا جب تک کہ دو گھنٹے انتظار کر لینے کے بعد معراجو میاں کی صورت نہ دکھائی دے گئی۔ بس بڑھے اور انہیں کلیجے سے لگا لیا۔ کیسے ہمدرد ہیں یہ اگلے وقت کے لوگ۔ کہنے لگے۔

''میاں کچھ ہو' خون کی محبت مارے نہیں مرتی' اپنے جسم کا کوئی حصہ سڑ جائے تو اسے کاٹ کے تھوڑی پھینکا جاتا ہے۔ تم نے جو کچھ کیا' خیر تم نے تو کیا کیا؟ یہ سب اسی مردار' حرام خور چھٹکی کے پچھن ہیں ورنہ تم تو خاصے بھولے بھالے تھے پر ہائے'' مارے رقت کے ان کی تقریر ادھوری رہ گئی اور معراجو میاں کے بھی آنسو نکل آئے۔ عرصے تک خاندان سے الگ رہ کر بڑی کمی سی محسوس کر رہے

تھے۔ اب جو ماموں نے پہل کر ڈالی تو سوچا خیر اپنے ماموں ہیں۔ پہلے میری عورت کے ساتھ جو برا سلوک کیا' اب اسے کیا کہا جائے۔"

اس دن وہ بڑے خوش رہے اور اس خوشی کے سلسلے میں کئی روز تک غصہ ان کے پاس نہ پھٹکا۔ چھٹکی نے سنا تو بہت خوش ہوئی۔ خاندان والوں نے اس کا اور معراجو میاں کا بائیکاٹ کر کے اسے سخت احساس کمتری میں مبتلا کر دیا۔ وہ سمجھتی تھی کہ شریف آدمی کی منکوحہ بن کر وہ بھی شریف بی بی کہلائے گی۔ لیکن گھر والوں اور محلے والوں نے چھٹکی جیسے ذلیل سے نام کو "چھٹکیا" کر کے اور بھی ذلیل کر دیا تھا۔ اس نے سوچا کہ اب گھر سے میل ہو جائے گا تو سب کو رام کر لوں گی خدمت کر کے۔

اس کے بعد ہی خاندان میں ایک تقریب ہوئی تو معراجو میاں کا بلاوا آیا۔ وہ خوش تو بہت ہوئے لیکن انہوں نے شرکت سے صرف اس لیے انکار کر دیا کہ میری عورت کو کیوں نہیں بلایا گیا۔ اس بار تو خیر لیکن جب خاص معراجو میاں کے ماموں کے ہاں تقریب ہوئی اور چھٹکی کا بلاوا بھی سرسری طور پر آیا تو چھٹکی اترا کر پہنچی۔ بالکل نئی دلہنوں کی طرح جو پہلی مرتبہ سسرال جاتی ہیں۔ وہی ٹخنوں سے اونچی سرخ جارجٹ کی ساری اور سرخ جالی کا جمپر کڑکڑاتے جاڑے میں زیب تن کیے' بڑا سا گھونگھٹ نکالے چھن چھن کرتی گھر میں جا اتری۔ سب بیبیوں کو جھک جھک کر سلام کیا' ممانی اماں سے جنہیں وہ کبھی مالکن کہہ کر پکارتی تھی' بہوؤں کی طرح زبردستی گلے لگی اور بدلے میں کئی کوسنوں سے بسی ہوئی آہیں لے کر سیدھی باورچی خانے میں پہنچ گئی جہاں تقریب کا کھانا تیار ہو رہا تھا۔ بس جھٹ پٹ سارا کام نبٹا لیا۔ خوش ایسی جیسے اپنے باپ کے گھر آئی ہو لیکن جب رات کو بجائے سب کے دسترخوان پر کھانے دینے کے الگ تھلگ دیا گیا تو بس اس کا منہ پھول گیا۔ گویا اسے شریف بیبیاں اپنے دسترخوان پر کھلاتیں؟ بڑی چوکھی تھی نا۔ اس بات پر جل کر اس نے گھر کی نئی ماما سے اس گھر کی کئی کنواری لڑکیوں کے بارے میں بری بری باتیں کہیں لیکن جب رخصت ہوتے وقت اس نے دیکھا کہ معراجو میاں کو ممانی اماں گلے سے لگائے ہچکیاں بھر رہی ہیں تو جیسے اس کے سارے جسم میں مرچیں لگ گئیں۔ اپنے گھر پہنچتے ہی اس نے بیر ڈلوانے کے لیے الگ کھانا دیے جانے کی شکایت کی اور معراجو میاں جو بڑی دیر سے کھوئے کھوئے سے تھے بپھر گئے۔

"اور نہیں تو کیا تجھے سر پر بٹھا لیتے وہ لوگ؟" انہوں نے آنکھیں نکال کر کہا تو چھٹکی کے حلق میں کوئی خشک سی شے اس طرح پھول کر چھا گئی کہ اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔

اس کے بعد معراجو میاں کے رشتے داران سے اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر ملتے جلتے رہے اور چھٹکی کے حلق میں کوئی خشک سی شے دن میں کئی کئی بار اس طرح پھولتی رہی کہ وہ منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکال پاتی۔ اور وہ کہہ ہی کیا سکتی تھی۔ اسے حق ہی کون سا تھا

منہ کھولنے کا؟ کیا نہیں جانتی تھی کہ غلاظت کا کیڑا غلاظت کے ڈھیر سے نکل کر اپنی موت آپ بلاتا ہے۔ اب وہ تمام تمام دن معراجو میاں کے رشتے داروں کو زیر لب گالیاں کوسنے دے دے کر رہ جاتی۔ جس جوانی پر اینٹھتی تھی وہی تین سال کے اندر اندر اسے دغا دے گئی اور جانے کون سی خاموش بیماری نے زور پکڑا کہ چہرہ دیکھ کر گھن آ جائے۔ بس دن کا زیادہ حصہ وہ کھری چارپائی پر اوندھی پڑ کر اور کمر سہلا سہلا کر گالیاں بکتے گزار دیتی۔ لیکن معراجو میاں کے گھر میں داخل ہوتے ہی جھٹ اٹھ کر اپنے بچھائے ہوئے جال کے گھسے پھٹے پھندوں میں گانٹھیں دینے لگتی۔ پہلے سے کہیں بڑھ کر خدمت کرتی پر اب خدا نے معراجو میاں کے کنبے والوں کی معرفت آنکھیں کھلوانا شروع کر دی تھیں۔ اس لیے تو اب چھٹکی کی یہ چلتر بازیاں انہیں زہر لگنے لگی تھیں۔ اس لیے وہ آئے دن کسی نہ کسی بات پر رکھ کر اس جان و عزت کے روگ کی پٹائی کر دیتے۔ مگر واہ ری بے حیا چھٹکی' اپنی سی کوشش کیے ہی گئی۔

آخر ایک دن مہترانی نے چھٹکی کے پاندان سے کھائی ہوئی تمباکو کے نشے میں جھوم کر بتایا کہ "معراجو میاں تو دوسرا بیاہ کرنے والے ہیں" بس تڑپ ہی اٹھی۔ ڈس کر بھاگتی ہوئی ناگن خود چوٹ کھا کر زہریلے بل کھانے لگی۔

"اری کس سے؟"

"وہی جو ہیں نا عزیزہ بٹیا' بڑا اخول کرتی ہیں معراجو میاں سے ان دنوں۔"

مہترانی نے تو یہ پھونک کر جھوا اٹھایا اور چلتی بنی لیکن چھٹکی نے اپنا پھیکا سا ہوا منہ پیٹ پیٹ کر وہ ہائے توبہ کی کہ سارے محلے کے کان کھڑے ہو گئے۔ بچاری عزیزہ کے لیے جانے کہاں سے پچاسوں ننگے قصے جوڑ کر ذرا ہی دیر میں سارے محلے میں براڈ کاسٹ ہوئے۔

عزیزہ بٹیا نے سنا تو کلیجہ پکڑ کر رہ گئیں۔ "افوہ! یہ کمینی اور میرے لیے کہے؟" ان کی آنکھوں سے آنسو روکے نہ رکتے۔ مانا کہ وہ معراجو میاں سے ادھر کچھ دن سے محبت کرنے لگی تھیں لیکن اس کا یہ مطلب تھوڑی تھا کہ وہ چھٹکی سے بھی پہلے انہیں چاہتی تھی۔ بھلا وہ اس وقت تھے ہی کیا جو کوئی انہیں منہ لگاتا؟

معراجو میاں نے شام کو عزیزہ کا چہرہ دیکھا جو روتے روتے چقندر بنا ہوا تھا اور بار بار ناک پونچھنے کی وجہ سے تو جیسے ناک سے خون ٹپکتا معلوم ہو رہا تھا۔ بس یہ دیکھ کر ان کا کلیجہ جیسے خون ہو کر رہ گیا۔ اتنے دن بعد تو گھر کی ایک لڑکی نے محبت سے آنکھیں ملائی تھیں۔ گھر والوں کی زبانی جب انہوں نے چھٹکی کے خیالات عزیزہ کے متعلق سنے تو آپے میں نہ رہے۔ بس انہیں ایسا محسوس ہوا کہ اب تک وہ اپنے جوتے سر پر رکھے پھر رہے تھے۔ تنتنا کر اٹھے' پیچھے سے برقع اوڑھ کر ممانی' عزیزہ اور عزیزہ کی اماں' ساتھ ہی گھر

کے دو چار مرد مجاہدوں کی شان سے۔

''نکل تو حرام زادی! نکل تو کمینی''

دھڑاک دھڑاک کر کے دروازے کے دونوں پٹ بھنچ گئے۔

شام کے ہلکے سے اندھیرے کو رات کی گہری تاریکی نگل چکی تھی۔ اور گلی کی ٹھنڈی پختہ زمین پر چھتکی نالی میں سر ڈالے بے حس و حرکت پڑی تھی۔ درد سے اس کا جسم پھوڑا ہو رہا تھا' سر میں میٹھی میٹھی گھمری تھی اور ہونٹوں پر ننگی ننگی گالیاں۔

دھت! کمینی!

◆◆◆